BOOK HOME
حوا کی بیٹی کی شب و روز کی حرف حرف سلگتی داستان
ہیرا منڈی
زاہد عکاسی

فہرست

دیباچہ

جب کہ طوائفوں کی زندگی اوران کی جسم فروشی کے بارے میں سچے جھوٹے واقعات اور سکینڈلز پر مبنی درجنوں کتابیں مارکیٹ میں پہلے سے موجود ہیں تو پھر ایک اور کتاب لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ ذرا ماضی میں جھانکیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہیرا منڈی کے موضوع پر پہلی کتاب پاکستان میں آغا شورش کاشمیری نے ''اس بازار میں'' کے نام سے لکھی تھی جو احمد بشیر کے ہیرا منڈی کے بارے میں لکھے ہوئے ایک فیچر پر مبنی تھی ان کا یہ فیچر شورش کاشمیری کے ہفت روزہ ''چٹان'' میں ہی شائع ہوا تھا۔ شورش نے اس سلسلہ میں باقاعدہ ریسرچ کی۔ اُس زمانے میں ہیرا منڈی بھی عروج پر تھی اور تماش بین بھی دل کھول کر دولت نچھاور کرتے تھے۔ بعدازاں فیلڈ مارشل صدر ایوب خان کے دور میں (غالباً یہ 1961 کی بات ہے) ان کے چہیتے گورنر مغربی پاکستان نواب آف کالاباغ ملک امیر محمد خان نے ایک آرڈی نینس کے ذریعے چکلوں میں کسبیوں کے بیٹھنے پر پابندی عائد کر دی البتہ گانے بجانے اور رقص دیکھنے کی اجازت دے دی۔ پتہ نہیں ملک امیر محمد خان نے جسم فروشی کی ممانعت خلوص نیت سے کی تھی یا پھر...... بہر طور اس پابندی کی وجہ سے کسبیاں اور رنڈیاں مختلف محلوں میں پھیل گئیں۔ ظاہر ہے پرانے محلے اور بستیوں میں تو وہ جا نہیں سکتی تھیں لہٰذا نئی آبادیوں میں انہوں نے ڈیرے جمائے اور نوجوان لڑکیوں کو ورغلا کر انہیں بھی یہی دھندہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور یوں کسبی اور رنڈی کے بعد معاشرے میں ایک اور ناسور کال گرل نے جنم لیا۔ رنڈیوں اور طوائفوں کے تو مختلف رکھ رکھاؤ،

طور طریقے اور اصول وضوابط ہوا کرتے تھے لیکن ان کال گرلز نے جنہیں عرف عام میں ٹیکسیاں بھی کہا جانے لگا شرم وحیا کے سارے بخیے ادھیڑ دیئے بلکہ تمام اقدار کی لٹیا ہی ڈبو دی۔ طوائف تو لاکھوں روپے خرچ کرنے کے بعد کسی تماش بین کے بستر کی زینت بنتی تھی لیکن کال گرل نے چار پانچ سو روپے تک میں بستر گرم کرنے شروع کر دیئے۔ جب بھوک ننگ، ضرورتیں مزید بڑھیں تو ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا اور جن کی گزر اوقات درس وتدریس، نرسنگ یا دفاتر میں کام کرنے سے پوری نہیں ہوتی تھی تو انہوں نے ایسے مقدس پیشوں کی آڑ میں چوری چھپے جسم فروشی کا دھندہ بھی شروع کر دیا تاکہ معاشرے میں تو نام ہو کہ فلاں عورت استانی، نرس یا کلرک کے طور پر محنت مشقت کر کے اپنے خاندان کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ ٹیلی وژن اسٹیشن قائم ہوتے ہی بعض کال گرلز نے اداکارہ اور فنکارہ کا لیبل لگا کر اس قبیح کاروبار کو اور بڑھاوا دیا۔ مثلاً ٹی وی میں کام کرنے والی جس لڑکی کو ڈرامے میں کام کرنے کے بمشکل تین سو روپے ملتے تھے وہ رات کے تین ہزار روپے تک بھی لیتی تھی۔ اور محلے میں یہی بتاتی تھی کہ میں تو ٹی وی میں کام کر کے پیسے کما رہی ہوں اور آرٹسٹ ہوں۔ مجھے ایک اداکارہ نے بتایا تھا کہ ہمیں پتہ ہے کہ ٹی وی کا ماحول کیا ہے۔ وہاں تو مفت بھی عزت لٹانی پڑ جاتی ہے لیکن باہر یہی مشہور کیا جاتا ہے کہ ٹی وی کا ماحول بہت بہتر ہے۔ جبکہ فلم انڈسٹری میں ٹی وی سے کم برائی ہے لیکن بدنام فلم انڈسٹری ہو رہی ہے۔

جنرل ضیاء الحق چونکہ ایک غاصب حکمران تھے لہٰذا خود اچھا بننے کے لیے انہوں نے جہاں سیاسی پارٹیوں کے کارکنوں پر تشدد کیا وہاں نیک نامی کے لیے ہیرا منڈی کو بھی نشانہ بنایا۔ ان لوگوں کو تنگ کرنے کے لیے اس نے رنڈیوں کے آفس (مجرا) لگانے کا وقت رات ساڑھے گیارہ بجے سے دو بجے تک مقرر کیا یوں رہی سہی گانے والیاں بھی علامہ اقبال ٹاؤن، فیصل ٹاؤن اور ڈیفنس میں منتقل ہونا شروع ہو گئیں۔ ڈیفنس کی آبادی کے بعد کال گرلز، رنڈیاں اور طوائفیں سکون محسوس کرنے لگیں کیونکہ ان آبادیوں میں رہائش اختیار کرنے کے

بعد ان لوگوں کے تعلقات انتظامیہ اور زندگی کے تمام بااثر افراد سے بھی ہو گئے جس کی وجہ سے اس آبادی میں چھاپوں کا خطرہ کچھ کم تھا اور پولیس بھی تنگ نہیں کرتی تھی۔ یوں اس آبادی میں یہ کام زوروں پر شروع ہوا۔ ڈیفنس کی کوٹھیوں میں خفیہ طور پر مجرے اور عیاشی کی محفلوں کا انعقاد شروع ہوا جس کا خاطر خواہ اثر ہیرا منڈی پر پڑا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں طوائفوں کی تعداد چھ ہزار سے گھٹ کر 50، 60 تک رہ گئی۔

مجھے ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع کیسے ملا تو یہ بھی ایک لمبی کہانی ہے۔ میں نے اپنا بچپن زیادہ تر لائل پور کے فیکٹری ایریا میں گزارا۔ فیکٹری ایریا میں دہلی کلاتھ اینڈ یارن لمیٹڈ کی ایک ملز لائل پور کی کاٹن ملز بھی ہوتی تھی جسے تپلی گھر کہتے تھے۔ یہاں ہر ماہ مل کے ملازمین کے لیے مشاعرہ یا ڈرامہ بھی ہوا کرتا تھا۔ سردیوں میں ڈرامہ ہال کے اندر اور گرمیوں میں کھلی گراؤنڈ (اوپن ایئر) میں ہوتا تھا جہاں ایک طرف بہت بڑا پختہ سٹیج بنایا گیا تھا۔ میں بھی یہ ڈرامے دیکھنے جایا کرتا تھا۔ بس یہیں سے ڈرامے کرنے اور اداکاری کا شوق پیدا ہوا۔ ان ڈراموں میں مزدور خود ہی عورتوں کے کردار بھی ادا کیا کرتے تھے کیونکہ مذہبی شہر ہونے کی وجہ سے ڈرامہ کے منتظمین لڑکیوں کو سٹیج پر لاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ میں نے بچپن میں خود بھی سکول و گھر کے لان میں ڈرامے کئے۔ پھر جب میونسپل کالج لائل پور میں 1959ء میں ڈرامہ ''سحر ہونے تک'' کیا تو اس میں میر صاحب کے کردار پر میں نے اول انعام حاصل کیا۔ اس ڈرامے کے ہدایت کار اعجاز ناصر تھے۔ یہیں سے میری ناصر کے ساتھ دوستی ہو گئی۔ اعجاز ناصر خود بھی اداکار اور بہترین آواز کا مالک تھا۔ اس کی آواز محمد رفیع سے بہت زیادہ مماثلت رکھتی تھی۔ وہ ڈرامے کا آغاز ان اشعار سے کرتا تھا:

خداوندا! مرتضےٰ ساقیا،
کچھ تو تسکین قلب ہو جائے!

یا جو ہے یہ سکون دل کو

اک روز یہ بھی سلب ہو جائے!

بہترین آواز اور پھر چکلہ کے سامنے والے محلّہ میں رہائش کی وجہ سے اُس کا آنا جانا ایک طوائف کے ہاں بھی تھا۔ یہ طوائف حمیدہ بیگم تھی جس کی سریلی اور اثر انگیز آواز کی وجہ سے دور دور سے لوگ اس کا گانا سننے آتے تھے۔ یہ تین بہنیں تھیں جو اوکاڑہ کی طرف سے آئی تھیں۔ ان کے نام میداں (حمیدہ) جیجاں (عزیزہ) اور کیجاں (کنیزہ) تھے۔ ناصر ہمیں حمیدہ کے ہاں اکثر لے جایا کرتا تھا اور پھر جب ہم نے یہی ڈرامہ ''سحر ہونے تک'' پرائیویٹ طور پر میونسپل ہال لائل پور میں کیا تو پس پردہ گلوکاری کے لیے حمیدہ ہمارے بڑا کام آئی۔ ڈرامے کی ریہرسل کے دوران جیجاں بھی اپنے ایک سرمایہ دار عاشق کو لے کر آجاتی تھی اور ریہرسل کی چائے وغیرہ کے پیسے اس سے دلاتی تھی۔ اکثر اوقات جب ناظرین اس کا گانا سننے آتے تو ہم لوگ دروازے کی اوٹ سے دیکھتے تھے۔

اسی طرح ایک لڑکے مشتاق کی والدہ بھی منجھی ہوئی طوائف تھی۔ مشتاق میرا کلاس فیلو تھا اور مجھے دوپہر کو اکثر اپنے گھر لے جایا کرتا تھا۔ اس کا گھر چکلہ کی ایک گلی میں تھا۔ اس کی والدہ ہماری بڑی خاطر مدارت کیا کرتی تھی اور ہمیں اچھے اچھے کھانے کھلایا کرتی تھی۔ مشتاق کی بہنیں رات کو مجرا کرتی تھیں اور ان کی بھی آواز سریلی تھی۔ بعدازاں جب فیلڈ مارشل ایوب خان کے گورنر کالا باغ کے حکم پر چکلے اور رنڈیوں کے بازار بند ہوئے تو لائل پور کے چکلہ میں کپڑا مارکیٹ کھل گئی اور ان طوائفوں کی جگہ کپڑے کے تاجروں نے لے لی۔ یہ تاجر جتنی نمازیں پڑھتے تھے اتنا ہی جھوٹ بولتے اور بلیک مارکیٹنگ کرتے تھے۔ اگر حج کرتے تو سمگلنگ بھی کرتے تھے۔ لائل پور میں مہنگائی کا موجب بھی یہی تاجر تھے جو ایک طرف بڑی بڑی بلڈنگیں بنا کر اس پر ''ھذا من فضل ربی'' لکھتے تھے اور دوسری طرف اپنے ملازمین کو بھوکا مارتے تھے۔ ہمارے وہاں کے استاد عبیر ابوذری جیسے شاعر کہتے تھے:

لے کے رشوت تے وڈی ___ اوپر لکھدے نے ھذا من فضل ربی۔

چکلہ اجڑا تو تمام طوائفیں لاہور منتقل ہو گئیں۔ حمیدہ اور اس کی بہنیں بھی لاہور آ گئیں۔ حمیدہ کی بیٹی نازلی نے فلموں میں بڑا نام کمایا جبکہ دوسری بیٹی زرقا نے گلوکاری میں نام بنایا۔ جیجاں کی نواسی مہر النساء بھی فلموں اور ٹی وی پر آتی رہی۔ حمیدہ نے علامہ اقبال ٹاؤن کے پاک بلاک میں گھر لے لیا اور ایک گھر فورٹ روڈ پر ڈینٹل ہسپتال کے قریب خرید کر کرائے پر دے دیا۔ اب یہ گھر اس کی بیٹی نگو کی ملکیت ہے۔

حمیدہ کی بیٹی اداکارہ نازلی پر مزاحیہ اداکار ننھا فریفتہ ہو گئے۔ اس نے اپنا سب کچھ حتیٰ کہ جان تک بھی نازلی کی بیوفائی کی نذر کر دی۔ ادھر حمیدہ لاج میں ریہرسل کے لیے ایک ہال کمرہ اور دفاتر تنویر جاوید نے کرایہ پر لے لیے کیونکہ وہ ایک پروموٹر ہونے کی حیثیت سے مختلف ممالک میں طائفے بھیجا کرتا تھا اور اب بھی بھیج رہا ہے۔ اس دفتر میں بشیر بھی ملازم ہے۔ جسے سب طوائفیں ماما مودا کی طرح ماما بشیر کہتی ہیں۔ بشیر حمیدہ کی تیسری بہن کیجاں کا بیٹا ہے۔ ایک روز اس نے مجھے دیکھا تو بلا بھیجا اور کچھ تصویریں شائع کرنے کے لیے دیں اس طرح اس کے پاس میرا آنا جانا مستقل ہو گیا۔ یہیں میری واقفیت کوثر اور نیر سے ہوئی۔ کوثر ایک اچھی گلوکارہ ہے اور نیر بھی اچھا گانے لگی ہے۔ یہ دونوں میرے ساتھ لندن اور مانچسٹر میں بھی رہیں اور میں نے انہیں کبھی بھی اوچھی حرکت کرتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ کسی سے جنسی رشتے استوار کرتے نظر آئیں۔ بس شاہدہ پروین کی طرح ان کی توجہ گلوکاری کی طرف ہی رہی۔ کوثر نے لندن کے علاوہ یونان، اٹلی، دہلی، چنڈی گڑھ، امرتسر، ابوظہبی میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

ان کے علاوہ مساوات کی فلم رپورٹنگ کے زمانے میں بھی میں نے اداکارہ نیلو، رانی، بابرہ شریف، نجمہ، نجمہ رومانی، سونیا، سنگیتا، کویتا اور شنا، شازیہ نہ جانے کس کس کو قریب سے دیکھا۔

یہ کتاب ''ہیرا منڈی'' بھی ہیرا منڈی میں واقع حمیدہ لاج کے ایک کمرے میں بیٹھ کر

لکھی گئی۔اس کمرے میں اکثر نوجوان طوائفیں آکر مجھ سے پیار لیتی رہیں اور مجھے اپنا بڑا سمجھتی رہیں۔اکثر نے ٹی وی اور فلموں میں کام کرنے کے لیے بھی فرمائشیں کیں۔

آج تک طوائفوں پر جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں ان کا یہی پہلو سامنے لایا جاتا رہا کہ طوائفوں نے لوگوں کو برباد کیا ہے۔یہ بُری عورتیں ہوتی ہیں ان سے بچنا چاہیے جبکہ میں نے ان کی اکثریت کو فن کی خدمت کرتے ہی دیکھا۔جتنے فن کار بھی اس وقت آپ کو ٹی وی، ریڈیو یا فلموں میں نظر آرہے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح اسی راستے سے ہو کر گزرے ہیں یا نکلے ہیں۔ طوائفوں کی نسبت میں نے گلبرگ، ڈیفنس اور علامہ اقبال ٹاؤن میں رہنے والی نام نہاد فن کار لڑکیوں کو چند ٹکوں کے عوض جسم بیچتے ہوئے دیکھا ہے۔طوائف نے اگر جسم ہی فروخت کرنا ہو تو انہیں سارا سارا دن رقص اور گانے کی مشقت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں یہ سچ ہے کہ ہیرا منڈی میں بھی جسم بیچنے والی ہوتی ہیں۔یہ وہ لڑکیاں ہوتی ہیں جنہیں اچھی طوائفیں بھی بُرا خیال کرتی ہیں۔اکثر لڑکیاں دیہات سے آکر جسم فروشی کرتی ہیں اور پھر جب رقص وغیرہ سیکھ جاتی ہیں تو یہ کام چھوڑ دیتی ہیں۔ایسی بہت سی لڑکیوں کو میں جانتا ہوں۔

بہر طور میں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا یا جو کچھ میرے سامنے بیتا آپ کی نذر کر دیا ہے۔اب انصاف آپ نے کرنا ہے کہ یہ کہاں تک درست ہے؟ میں نے شورش کاشمیری کی کتاب کے علاوہ اس موضوع پر اور بھی بہت سی کتابیں دیکھی ہیں لیکن شورش کی کتاب مجھے پھر بھی سب سے بہتر لگی ہے کیونکہ اس میں ادب کی چاشنی بھی ہے اور فن کی خوشبو بھی۔

اس کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں، میں اپنے دوستوں ابوالحسن جابر اور جمیل قریشی کا بہت ہی ممنون ہوں جنہوں نے مجھے بعض اہم معلومات فراہم کیں۔

زاہد عکاسی

مارچ 2005ء

لاہور

کتاب پر بی بی سی کا تبصرہ

پاکستان میں جسم فروشی کے موضوع پر اولین تحقیق احمد بشیر کی تھی جو کہ ایک مضمون کی شکل میں ہفت روزہ چٹان میں شائع ہوئی، بعد میں جریدے کے ایڈیٹر شورش کاشمیری نے اس موضوع پر باقاعدہ ریسرچ کی جس کے نتائج انہوں نے ایک کتاب کی شکل میں شائع کیے۔ عنوان تھا ''اس بازار میں''۔

مصنف زاہد عکاسی کا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں طوائفوں کی زندگی پر یہ پہلی تحقیقی دستاویز تھی۔ لیکن شورش کی کتاب کو چھپے آدھی صدی بیت چکی ہے۔ اس دوران نہ صرف راوی کے پُل تلے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے بلکہ راوی کنارے آباد شہر کی طوائفوں کے رنگ ڈھنگ اور طور طریقے بھی بدل چکے ہیں لیکن زاہد عکاسی کی کتاب ''ہیرا منڈی'' محض لاہور کی طوائفوں کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ اس پیشے پر ایک باقاعدہ تحقیقی مقالہ ہے جس میں ایک طرف یونان اور ہندوستان کی قدیم تہذیبوں میں طوائف کے مقام کی نشاندہی کی گئی ہے تو دوسری جانب جدید یورپ اور امریکہ میں اس پیشے کے اسرار و رموز بیان کیے گئے ہیں۔

مقامی طوائفوں کی مختلف قسموں کا احوال مصنف نے تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس سلسلے میں ہیجڑوں پر بھی ایک علیحدہ باب رقم کیا ہے۔ مقامی طوائفوں کے عقائد اور رسوم و رواج بیان کرنے کے بعد مصنف زاہد عکاسی نے لاہوری طوائفوں کی وہ مخصوص زبان بھی پیش کی ہے جسے وہ پیشہ ورانہ گفتگو میں استعمال کرتی ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

لوراڈھوراا ے (لڑکا پیسے والا ہے)

لوراہنوا ے (لڑکا بھوکا ننگا ہے)

لورئیے نتھی رہ (اے لڑکی! خاموش رہ)

بھونڈی نہ خطا (بُری بات نہ کر)

کتاب کے چند دیگر ابواب یہ ہیں: طوائف اور فلمی شاعر، طوائف اور منٹو، ٹیلی ویژن اور بازار حسن۔

مصنف نے بازار حسن سے تعلق رکھنے والی معروف گلوکاراؤں کے حالاتِ زندگی بھی بیان کیے ہیں اور اس فہرست میں ملکہ ترنم نور جہاں، ملکہ پکھراج اور فریدہ خانم سے لے کر ناہید اختر، ثریا خانم اور مہ ناز تک کوئی پندرہ سنگرز کا احوال درج ہے۔ البتہ اس بازار سے فلموں کی نگری میں آنے والی خواتین کا تذکرہ بہت مختصر ہے اور صرف چھ اداکاراؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔

اپنے ذاتی تجربے اور براہ راست حاصل کی گئی معلومات کے ذکر سے مصنف نے اس تحریر میں ایک چاشنی پیدا کر دی ہے۔

(عارف وقار)

طوائف کال گرل اور ویشیا

کہا جاتا ہے کہ دنیا کے قدیم ترین پیشوں میں سے ایک پیشہ طوائفیت کا ہے۔ مرد نے اپنے قبضہ قدرت کے باعث اس پیشے کو فروغ دیا...... مگر کس لیے؟ کچھ لوگ اور کئی قسم کے حالات تھے جو اس کی بقا کے لیے کارفرما رہے۔ امریکہ کی عظیم مفکرہ ''آنڈریا ڈارکون'' اس ضمن میں اپنی نئی کتاب'' کاما سوترا'' میں سلگتے سوال اٹھاتی ہیں اور معاشرہ کی دکھتی رگوں پہ ہاتھ رکھ کر سوال کرتی ہیں کہ کیا اس پیشے کو مردانگی کے تصور کو تقویت پہنچانے کے لیے جاری رکھا گیا؟ یورپ میں شوکیس میں بٹھائی گئی عریاں عورت رات گئے تک منتظر کس نظام کی پیداوار ہے؟ اگرچہ سوشلسٹ نظام نے طوائفیت کو یکسر ختم کر دیا تھا مگر انڈریا پوچھتی ہے کہ ''آج کل ایڈز کا چرچا ہونے کے باوجود اس مذموم پریکٹس کے موثر سدباب کے لیے کوئی تحریک کیوں نہیں اٹھائی گئی؟ نام نہاد شرفاء کے سفید پوش معاشرہ میں ایک بیچاری طوائف کی توقیر و تعظیم کہاں ہو سکتی ہے؟ ہمارے اس انسان کش اور عورت دشمن سماج میں طوائف تو ایک غلیظ گالی اور خبیث نام ہے۔

اخلاقیات کے بڑے بڑے مبلغین اور بڑے بڑے صالحین کو طوائف کے نام سے بھی بدبو آتی ہے۔ دین دھرم، حرم اور بھرم کے اجارہ دار یہ قطعاً نہیں سوچتے کہ طوائف بھی کسی کی بیٹی، کسی کی بہن اور کسی کی ماں ہے۔ نامور شاعرہ کشور ناہید اپنے ایک اخباری کالم نفسیات کی تشریحات میں رقم طراز ہیں: '' ہمارے ملک میں بظاہر طوائف خانے بند ہیں۔ مگر صرف ایک

شام کس بھی ویڈیو کی دکان پر کھڑے ہو کر یہ دیکھ لیں کہ کون کون کیا کیا لے کر جا رہا ہے تو سارے اشرافیہ کا پول کھل جائے گا۔'' اخلاقیات کے مبلغین یہ نہیں سوچتے کہ عورت کو طوائف کس نے بنایا؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ ایک صاحب فکر مصنف خواجہ شفیع دہلوی نے اپنی کتاب ''ناکام'' میں اس کا جواب کچھ یوں دیا ہے۔ ''عقل انسانی نے جو سے بیئر (Beer) بنائی، انگور سے شیمپین اور عورت سے رنڈی۔''

بازاری عورتیں سماج کی پیداوار ہیں اور سماج کے وضع کردہ قوانین کی کھاد ان کی پرورش کرتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انہیں بے گانہ تصور کیا جائے اور کیوں ان کی موت کی تدبیریں سوچی جائیں جبکہ وہ سماج کا ایک حصہ ہیں اس کے جسم کا ایک عضو ہیں۔ اگر ان کو اچھا بنانا درکار ہے تو سارے جسم کے نظام کو درست کرنا ہوگا۔ جب تک سماج اپنے قوانین پر ازسرنو غور نہیں کرے گا وہ نجاست دور نہ ہوگی۔ برصغیر کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو لکھتے ہیں کہ ''کیا وجہ ہے کہ عورتوں کا جسم بیچنا حیرت اور نفرت سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسی عورتوں کا وجود ہرگز ہرگز حیرت خیز یا نفرت انگیز نہیں۔ ویشیا پیدا نہیں ہوتی بنائی جاتی ہے۔ جس چیز کی مانگ ہوگی منڈی میں ضرور آئے گی۔ مرد کی نفسانی خواہشات کی مانگ عورت ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔''

طوائف کو عزت دار گھرانہ میں بہو کی صورت میں قبول اس لیے نہیں کیا جاتا کہ وہ عورت عصمت باختہ ہے۔ وہ اپنا گوہر آبرو گنوا چکی ہے۔ وہ زیور عصمت باختہ ہو سکتی ہے تو مرد کیوں نہیں؟ مرد، مرد رہتا ہے چاہے وہ کتنا ہی سیاہ کار، گناہ گار ہو اس کی غیرت عزت مردانگی پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ جبکہ بالا خانہ پہ بٹھائی گئی عورت نہایت بلند پایہ ادیب ہو سکتی ہے اس کے خیالات و افکار سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ہندوستان قدیم میں شہزادے باقاعدہ بالا خانوں پر معاشرتی زندگی کے آداب و اخلاق سیکھنے جاتے تھے۔ بقول احمد فراز:

ڈھونڈ اجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی

یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

مفکر اسلام سرسید احمد خان خانہ خدا کی تعمیر میں حصول زر کے لیے بالا خانوں کے دروازوں پر دستک دینا معیوب نہ سمجھتے۔ انقلاب فرانس میں پہلی گولی پیرس کی ایک طوائف نے اپنے سینے پر کھائی تھی۔ امرتسر کے جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثہ کی ابتدا جس پہلے نوجوان شہید کے خون سے ہوئی وہ ایک طوائف کا بیٹا تھا۔ طوائف کو بیٹی، بہن، بہو تسلیم نہ کرنے والے ''وائٹ کالر'' اندر سے کتنے بلیک (Black) ہوتے ہیں ان کے من کی کالک ان کے فن کی سفیدی سے زیادہ سیاہ ہوتی ہے۔

عصمت فروشی کوئی خلاف عقل چیز نہیں یہ ایک پیشہ ہے جس کو اختیار کرنے والی بے اختیار و لاچار عورتیں سماجی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنا تن بیچتی ہیں۔ جسمانی تجارت سے اپنا پیٹ پالتی ہیں۔ مزدور اور طوائف کی حالت زار ایک جیسی ہے۔ مزدور زندہ رہنے کے لیے اپنی محنت بیچتا ہے اور طوائف اپنا جسم۔ یہ تو اپنی بقا کا مسئلہ ہے۔ عورت اپنی تاریک تجارت کے باوجود روشن روح کی مالک ہو سکتی ہے۔ اس بات کو ذہن نشین رکھیے ہر عورت کسبی نہیں ہوتی بلکہ ہر کسبی عورت ہوتی ہے۔ جب یہی مجبور عورت اپنے پیشے کا لباس اتار کر رشتوں کے تقدس کی تشنگی محسوس کرتی ہے تو پھر مرد کی غیرت جاگ اٹھتی ہے اور اس کی غیرت کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ممتاز ادیبہ ممتاز شیریں عورت دوست منٹو کے بارے میں لکھتی ہیں: ''منٹو آدم کی جرأت گناہ کا قائل ہے۔ منٹو کا انسان نہ نوری ہے نہ ناری۔ وہ آدم خاکی ہے، وہ وجود خاکی جس کے سامنے خدا نے نوری فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔''

شورش کاشمیری جیسا اپنے عہد کا مرد قلندر شاہی محلے کے شوکیسوں میں بجتی حوا کی مظلوم و مجبور بیٹیوں کو ملنے خود اس بازار میں جاتا ہے۔ ان زندہ لاشوں کو ملتا ہے ان سے حال دل سنتا ہے۔ ان کی بے چارگی، بے بسی اور بے کسی کے محرکات تلاش کرتا ہے اور پھر عہد آفریں کتاب

''اس بازار میں'' تخلیق ہوتی ہے۔ وہ مرد قلندر اپنی قد و قامت، قبہ و دستار کی پرواہ نہیں کرتا۔ مگر دین کے ٹھیکدار اور اخلاقیات کے چوہدری ایسے شاہی محلوں سے دامن بچا کے چلتے ہیں مبادا انہیں کوئی دیکھ نہ لے اور ان کی پارسائی کا بھرم کھل جائے۔ حالانکہ بقول ساحر لدھیانوی:

مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیغمبر کی امت زلیخا کی بیٹی
ثناء خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں

منٹو کا عظیم افسانہ ''لائسنس'' اس موضوع پر لکھا گیا ہے کہ ایک عورت کو حصول معاش کے لیے تانگہ چلانے کا اجازت نامہ نہیں ملتا مگر جسم بیچنے کا لائسنس اسے مل جاتا ہے۔ نیپلز یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی جدید تحقیق کے مطابق سولھویں صدی کی دیو مالائی حسن کی مالکہ مونا لیزا اپنے دور کی مقبول اور مہنگی ترین طوائف تھی۔ جسم فروش خواتین کی تجارت کا دھندا مختلف علاقوں میں مختلف ہے۔ تاہم نام نہاد وکلا، مولوی حضرات، نام نہاد نکاح خواں، نام نہاد گواہ اس مذموم کاروبار میں ملوث ہیں۔ مجبور عورتوں کو طوائف بنانے کا خوفناک عمل جاری و ساری ہے (رپورٹ 1996/HRCP)۔

پاکستان کی باشعور باغیرت جرأت مند خواتین ''زنا بالجبر'' کے خلاف ایک باقاعدہ اور باضابطہ تنظیم وار (WAR) کا قیام بھی عمل میں لائی ہیں۔ مرد کی بالادستی کے اس معاشرہ میں مرد کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جسے چاہے تقدس و پاکیزگی کے آسمان پر بٹھا دے اور جسے چاہے غلاظتوں کے گٹر میں ڈال دے۔ اپنے طور پر یہ تعین کر لیا گیا ہے کہ ایک طوائف محبت کے سچے جذبات سے عاری ہوتی ہے۔ کسی مرد سے اس کی محبت کی داستان سامنے آتی ہے تو خاصی مضحکہ خیز نظر آتی ہے حالانکہ دل اور اس کی دھڑکنوں سے عصمت فروشی یا پاکیزگی کا کوئی تعلق نہیں۔ ایک باعصمت عورت کے سینے میں محبت سے عاری دل ہوسکتا ہے اور اس کے برعکس

ایک طوائف محبت سے معمور و بھرپور دل کی مالک ہو سکتی ہے۔ شورش کاشمیری جیسا مرد قلندر جب اس بازار سے ہو کر آیا تو چیخ اٹھا کہ ''مجھے اختیار ہوتا تو بڑے بڑے عماموں کے پیچ کھولتا، واعظوں کی دستار فضیلت کے پھریرے بنا کر بالا خانوں پہ لہراتا، عالمگیری مسجد کے دروازے پہ کھڑا فقیہہ شہر کو للکارتا، اس کی دراز قبا کو پھاڑ ڈالتا، اس کے ٹکڑے دریدہ عفتوں کے حوالے کرتا تاکہ اس سے اپنی برہنگی ڈھانپ سکیں۔''

ایک طوائف کو عزت دار گھرانہ میں بہو کی صورت میں اس لیے قبول نہیں کیا جاتا کہ نام نہاد عزت دار گھرانے چاہتے ہیں کہ ان کا بھرم رہ جائے۔ نام نہاد شرفاء طعنے نہ دیں نام نہاد بھلا مانس معاشرہ انہیں جینے کے حق سے محروم نہ کر دے۔ ان کی زندگی اجیرن نہ ہو جائے کیونکہ شرافت کی اس منڈی میں طوائف، بیگانگی، شرمندگی، کمینگی اور گندگی کی علامت ہے۔ پروین شاکر نے کہا:

میں سچ کہوں گی، پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

(بشکریہ مشتاق جاوید)

قبل از تاریخ عصمت فروشی

عصمت فروشی دنیا کا قدیم ترین پیشہ ہے۔ بعض محققین کہتے ہیں کہ دنیا میں سب سے پہلے جو جنس بیچی یا خریدی گئی وہ عورت کی عصمت ہی تھی۔ اسی عورت کی خاطر بابا آدم کو جنت سے نکل کر زمین پر آنا پڑا تھا۔ ہابیل اور قابیل کی لڑائی بھی اسی عورت کی وجہ سے ہوئی اور دنیا میں پہلا قتل بھی عورت کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔

مرد اور عورت دو مختلف صنف ہیں اور جب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ان کا ایک دوسرے کی طرف کھچے چلے جانا ایک فطری تقاضا ہے۔ ہوسکتا ہے شروع میں کسی مرد نے گوشت، اناج یا پھل کی خاطر عورت سے جنسی روابط کی کوشش کی ہو اور عورت نے بھوک یا لالچ میں اپنا جسم اس کے سپرد کر دیا ہو یوں ضرورت نے جنس کے لیے بارٹر سسٹم کا کام کیا ہوگا۔

دنیا مختلف ادوار سے ہو کر گزری ہے۔ ابتدائی سماج میں انسان جب غاروں میں رہتا تھا تو اس وقت ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے۔ جانوروں کی طرح ہی اولاد پالنے کی ذمہ داری اس دور میں صرف عورت پر تھی۔ جس طرح بکری، بلی یا دوسرے مادہ جانور اپنے بچوں کو ساتھ لیے پھرتے ہیں اور ان بچوں کے باپ کا کچھ پتہ نہیں ہوتا تو ایسے ہی عورت کی اولاد کو بھی اپنے باپ کا پتہ نہیں ہوتا تھا۔ عورت جو فطرتاً کمزور ہے۔ اپنی اور اپنے بچوں کی بھوک مٹانے کے لیے جنگلی شکار کے کچھ حصے کے بدلے مرد سے جنسی روابط قائم کرنے پر مجبور ہوتی۔ دوسرے جو کھانے کو کچھ دیتا اس کی ہو جاتی لیکن جب قبیلہ وارانہ سماج کی بنیاد پڑی تو قبیلہ کے طاقت ور سردار نے اپنے پاس کئی کئی عورتیں رکھنا شروع کر دیں اور یوں مرد سے وراثت کا

آغاز ہوا۔ عورت محض بچے پیدا کرنے والی مشین سمجھی جانے لگی۔ پھر جب انسان نے دیوتاؤں کی پرستش شروع کی اور ان کے نام سے عبادت گاہیں تعمیر کیں تو جنس کا تعلق مذہب سے بھی ہوگیا۔ جس طرح عورت سے جنسی روابط کر کے مرد کو تسکین حاصل ہوتی تھی اور اس کے بدلے میں عورت کو اولاد ملتی تھی اسی طرح انسان کو عبادت کر کے تسکین محسوس ہونے لگی دراصل مذہب اور جنسی روابط دونوں جذبات کی تسکین کا ذریعہ تھے۔ یونان کے اپی کورس یا بھارت کے بلبھ سوامی اور دام مارگی فرقے کے لوگوں میں جنسی اختلاط ہی کو شکر نعمت اور عبادت کا درجہ قرار دیا اور جب مذہب میں تصوف کا عنصر آگہی آیا تو اس کا تعلق جنس کے ساتھ اور بھی واضح ہوگیا۔ ہندو سماج میں مندروں اور یونانی اور یورپی سماج میں معبدوں میں دیوداسیوں کا رواج پڑا۔ ہندو سماج میں اگر مندروں میں دیوداسیاں رقص کر کے پروہتوں اور دوسرے لوگوں کا دل لبھاتیں تو مسلمانوں میں پیروں اور صوفیاء کے مزاروں پر طوائفیں مجروں کے ذریعے لوگوں کو نہ صرف خوش کرتیں بلکہ اسے ثواب بھی سمجھتیں۔ اب بھی حضرت داتا گنج بخش، حضرت معین الدین چشتی، کلیئر شریف، شاہ بری لطیف اور شہباز قلندر کے مزاروں پر جب عرسوں کے مواقع ہوتے ہیں طوائفیں رقص کر کے اور دھمال ڈال کر روح کو تسکین پہنچاتی ہیں۔

طوائفیت شراب کی طرح ہی زمانہ جہالیت سے بھی پہلے سے مروج رہی ہے۔ اگرچہ بعض مذاہب نے اسے ناجائز قرار دیا لیکن اس کے باوجود یہ جاری ہے۔ یورپی معاشرہ میں اسے قانونی حیثیت حاصل ہوگئی ہے لیکن ایک حد کے اندر رہ کر مثلاً انسان اگر ایک حد سے زیادہ شراب پی کر گاڑی چلائے یا باہر گھومے تو پولیس اسے ضرور گرفتار کر لیتی ہے اس کا ڈرائیونگ لائسنس منسوخ کر دیتی ہے۔ مثلاً آپ راہ چلتی کسی لڑکی کو اس کی مرضی کے خلاف جنسی ضرورت کے لیے اشارہ بھی نہیں کر سکتے اور آپ نے اسے مجبور کیا تو پولیس آپ کو پکڑ کر فوراً ہی اندر کر دے گی۔ ہاں اگر عورت کی مرضی ہو تو پھر آپ اس کے ساتھ کہیں بھی جنسی تسکین حاصل کر سکتے ہیں۔

یونان میں طوائف:

یونان میں شروع ہی سے عورتوں کو پیشہ کرنے کی اجازت تھی اوران سے باقاعدہ ٹیکس لیا جاتا تھا۔جنگوں میں فوجیوں کے ساتھ ساتھ طوائفوں کے قافلے بھی چلتے تھے اور وہ راستوں میں جب فوجی ستانے کے لیے پڑاؤ ڈالتے تو ان کے دل بہلاتی تھیں۔بعض لڑکیاں شادی سے پہلے یہ پیشہ اس لیے اختیار کرتی تھیں تا کہ اس رقم سے اپنی شادی کے جہیز کا بندوبست کر سکیں لیکن جہیز کا رواج صرف ہندوستان میں ہی تھا۔بابل کے لوگ اپنی عورتوں کو افرودیتہ دیوی کے مندر میں مردوں سے اختلاط کے لیے بھیجتے تھے۔ہندوستان میں بھی عورتیں اولاد نرینہ کی خاطر مندروں میں ہی جا کر شولنگ کی پوجا کرتیں اور اسے اس کے ساتھ اپنے مخصوص حصہ کو رگڑتی تھیں دراصل وہ کسی نہ کسی طاقتور پروہت سے اپنی جنسی تسکین حاصل کر کے باہر آتی تھیں۔یوں ان لوگوں کا کہنا تھا کہ جن عورتوں کا جنسی تعلق کسی پروہت یا پنڈت سے ہوتا تو اس سبب سے طاقتور اولاد پیدا ہوتی ہے جو راجوں، مہاراجوں کے لشکروں میں دشمن سے نبرد آزما ہونے کے کام آتی تھی۔

افرودیتہ دیوی کے مندر میں جانے والی عورتیں چوٹی میں پھول گوندھ لیتی تھیں اور غیر مردوں کی راہ تکتی تھیں۔جب کوئی عورت کسی مرد کو پسند آ جاتی تو وہ چاندی کا سکہ اس کی جھولی میں پھینک دیتا اور وہ اسے قبول کر کے اس کے ساتھ ہو لیتی اور جب گھر لوٹتی تو اسے فخر کی چیز سمجھا جاتا۔یونان میں فلوریا دیوی کا میلہ آٹھ دن لگتا تھا اور ان آٹھ دنوں میں زائروں کے لیے لڑکیاں دادعیش ونشاط مہیا کرتی تھیں۔افریقہ میں اعضائے جنس عبادت کا جزو تھے اور لوگ اپنی اپنی دکانوں اور مکانوں پر لٹکائے رکھتے تھے۔ہندوستان میں جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اس کی نشاندہی شولنگ سے ہوتی ہے۔

مختلف ادوار میں طوائف:

مختلف ادوار میں طوائف کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے۔ جنگلی سماج، قبیلہ وارانہ دور، غلامانہ دور جاگیردارانہ سماج اور اب سرمایہ دارانہ دور میں بھی عورت عام جنسوں کی طرح ایک جنس محض ہو کر رہ گئی ہے۔ جاگیردارانہ سماج میں جاگیرداروں نے طوائف کو صرف دل لبھانے کے لیے استعمال کیا اور اسے زیادہ سے زیادہ بخششیں دیں۔ اسکے مجروں سے دل بہلایا۔ بیاہ شادیوں کی محفلوں میں پنجاب کے جاگیردار شراب اور طوائف کا مجرا لازمی کراتے تھے۔ پاکستان میں چونکہ ابھی تک جاگیرداری نظام موجود ہے لہٰذا زیادہ سے زیادہ طوائفیں ان ہی علاقوں میں ہیں جہاں جاگیرداروں کی زمینیں ہیں۔ سندھ کے بعد جنوبی پنجاب کی سرائیکی پٹی طوائفوں سے بھری پڑی ہے۔ لاہور کی فلم انڈسٹری میں زیادہ تر اداکارائیں اسی علاقے سے آتی ہیں۔ لیہ، کہروڑ پکا، بہاولپور، احمد پور شرقیہ، ملتان، تلمبہ، ساہیوال، اوکاڑہ اور پتوکی ان کے گڑھ ہیں۔ جن طوائفوں نے ترقی کرنی ہو وہ لاہور کا رخ کر لیتی ہیں۔ یوں تو ایشیائی طوائفوں کا معاشرتی نظام یورپ کے معاشرتی نظام سے مختلف ہے لیکن جنسی اعتبار سے ایک جیسی ہیں۔ یورپ چونکہ جنسی طور پر آزاد ہے اور وہاں پر انسان کا بنیادی حق ہے کہ حکومت اس کو زندگی کی ضرورتوں کا تحفظ دے لہٰذا وہاں دوستی کی آڑ میں بھی جنسی تسکین حاصل کر لی جاتی ہے۔ برطانیہ میں ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہاں اب بیوی کا وجود برائے نام رہ گیا ہے۔ میاں بیوی بغیر نکاح کیے بوائے فرینڈ یا گرل فرینڈ کا نام دے کر برسوں اکٹھے رہتے ہیں۔ ان کے بچے بھی ہوتے ہیں لیکن وہ کسی کو دوش نہیں دیتے جب اکتا جاتے ہیں تو ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ معاشرہ میں روپیہ ہی خدا ہوتا ہے لہٰذا روپے سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ بیکاری، بیروزگاری، اونچ نیچ، بھوک ہر قسم کی مصیبتیں اسی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کیونکہ انتہائی

محنت و مشقت کے باوجود عام آدمی کی دسترس سے روپیہ باہر ہوتا جا رہا ہے۔اب تو اسے اپنی محنت کے عوض اتنا بھی معاوضہ نہیں ملتا کہ وہ اپنی ضروریات زندگی پوری کر سکے۔لہٰذا اس صورت حال میں غریب طبقے کی اکثر خواتین بلکہ امراء کے طبقے کی بعض خواتین (شوقیہ) جنس فروشی کا دھندہ شروع کر دیتی ہیں کیونکہ:

سنسار کی ہر ایک بے شرمی غربت کی گود میں پلتی ہے
چکلوں میں ہی آ کر رکتی ہے فاقوں سے جو راہ نکلتی ہے

جرمنی میں عصمت فروشی:

جرمنی بھی یورپ کا ایک ملک ہے اور جب سے یورپین یونین قائم ہوئی ہے تو آپ کسی ایک ملک کا ویزا لے کر مغربی یورپ کے دوسرے ملک میں بھی جا سکتے ہیں۔لندن، مانچسٹر اور دوسرے شہروں کے علاقہ پکاڈلی کی طرح جرمنی کے شہر ہمبرگ میں بھی ہیرا منڈی موجود ہے۔ وہاں عموماً عورتوں اور مردوں کا ہجوم رہتا ہے جہاں لاہور کی ہیرا منڈی کی طرح کی گلی بازار شیخو پوریاں کا نظارہ پیش کرتی ہے (اب بازار شیخو پوریاں میں کوئی طوائف نہیں بیٹھی بلکہ جوتیوں کی دکانیں کھل چکی ہیں۔طوائفیں چیت رام روڈ کے درمیان میں یا تحصیل بازار تک محدود ہو گئی ہیں اور وہ بھی صرف بیس پچیس کمروں پر مشتمل ہے جہاں مجرا ہوتا ہے)۔

ہمبرگ کے اس تنگ بازار میں ہر عمر کی طوائفیں موجود ہوتی ہیں۔ پیشہ ور عورتیں کھڑکیوں اور برآمدوں میں نیم برہنگی کے عالم میں بیٹھتی ہیں۔اگر گاہک ظاہر کے علاوہ باطن پر بھی نظر ڈالنا چاہے تو کھڑے کھڑے ہی انتظام ہو جاتا ہے۔وہاں بھوک اور مجبوری کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ عورتیں مزید دولت کمانے کے لیے ایسا دھندہ کرتی ہیں۔حالانکہ وہاں بیروزگاری الاؤنس کی شکل میں انہیں ماہانہ وظیفہ بھی مل سکتا ہے لیکن بعض عورتیں دوسرے مردوں کے جسم

نچوڑنے کی شوقین ہوتی ہیں۔ وہاں بھی عام لوگ ایسے بازاروں کے خلاف ہیں لیکن ہمبرگ میونسپلٹی نے اسے اپنے شہر کا قدیم کلچر سمجھ کر برقرار رکھا ہوا ہے۔

یورپ میں جنسی آزادی کی وجہ سے ویسے تو چکلے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس میں عورت کی مرضی کو دخل زیادہ ہوتا ہے۔ وہاں دولت اندوزی اور کاروبار کے تشدد نے انسانی رشتے ختم کر ڈالے ہیں اور یہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے جذبوں میں صرف میکانکی عمل کا ذوق باقی رہ گیا ہے۔ افسوس دولت کے غیر مساوی تقسیم نے انسان کو جب وہ مشین کی بے پناہ استعداد تخلیق کا غلام ہو گیا تو اس کے نازک جذبے کچل ڈالے گئے۔ اس مشینی دور نے انہیں دولت کے ہونے نے مارا اور ہمیں دولت کے نہ ہونے نے:

دل کے نازک جذبوں پر بھی راج ہے سونے چاندی کا
یہ دنیا کیا قیمت دے گی سادہ دل انسانوں کی

بھارت میں سیکس ورکرز:

پاکستان میں چونکہ جنسی گھٹن کی بنا پر منافقت انتہا پر ہے لہٰذا ہر شخص ہی منافقت سے کام لیتا ہے۔ بھارت میں اب پیسے کے بدلے میں جنسی ضرورت پوری کرنے والی عورتوں کو کال گرلز، ویشیا یا طوائف کی بجائے سیکس ورکر کا نام دے دیا گیا ہے اور وہاں اسے قانونی طور پر پیشہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ بھارت میں بڑے بڑے شہروں میں سیکس ورکر کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔ پاکستان میں بھی اس کی تعداد ہزاروں تک ہے۔ مختلف پرائیویٹ اداروں میں کام کرنے والی عورتیں بھی عارضی طور پر جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہیں اسی طرح ان اداروں میں کام کرنے والی لڑکیاں بالآخر یہی دھندہ کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ ہر انسان کو بھوک ہر چار گھنٹے بعد لگتی ہے اور اس کے لیے بہر حال پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے ایسے میں لڑکیاں اپنے اداروں

میں زیادہ نہیں تو ایک آدھ دوست ضرور بنا لیتی ہیں۔ کراچی کی اشتہاری فرم میں کام کرنے والی ایک رائٹر نے بتایا کہ میں نے فلاں کمپنی کو چھوڑ کر فلاں میں ملازمت کرلی ہے۔ اس کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے بتایا کہ وہاں دو باسوں کو خوش کرنا پڑتا تھا یہاں ایک ہی باس ہے لہٰذا میں نے اسی کو قبول کرلیا ہے۔

جسم فروشی کا دھندہ زیادہ تر حاجت مند لڑکیوں میں شروع ہوتا ہے۔ پہلے پہل تو وہ اسے مجبوری کے طور پر اپناتی ہیں پھر یہ ان کا پیشہ ہی بن جاتا ہے۔ ایک لڑکی روبینہ نے مجھے بتایا کہ میں شروع میں گھر سے کام کرنے کے لیے نکلی تھی کیونکہ میرا باپ اندھا ہوگیا تھا اور ماں بیمار تھی۔ میں نے سمن آباد کی ایک گارمنٹس فیکٹری میں کام شروع کیا۔ وہاں مجھے محلے کی ایک عورت لے کر گئی تھی وہاں میری طرح کی اور بھی لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ شروع میں چند دن تو ٹھیک گزرے پھر مالک نے مجھے اپنے پاس بلایا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے بات نہ مانی تو وہ مجھ پر سختی کرنے لگا اور ایک مہینے بعد میری چھٹی کرادی۔ گھر میں کچھ پیسے آئے تو چولھا گرم ہونے لگا لیکن میں پھر بیروزگار ہوگئی۔ چونکہ میری تعلیم واجبی تھی لہٰذا میں کسی لڑکیوں کے سکول میں استانی بھی نہیں لگ سکتی تھی۔ چند دن سوچ بچار کے بعد میں اسی فیکٹری کے مالک کے پاس گئی اور ملازمت طلب کی۔ اس نے کہاں میں تمہیں دو ہزار روپے کے بجائے تین ہزار روپے مہینہ دوں گا لیکن میری بات ماننی پڑے گی۔ میں خاموش رہی اور اپنے گھریلو حالات دیکھتے ہوئے میں نے وہاں کام شروع کردیا۔ چند روز بعد وہ کام کے اوقات میں ہی مجھے اپنے ساتھ اپنی ایک واقف کار کے گھر لے گیا جہاں اس نے شراب پی اور میرے ساتھ انجوائے کیا۔ مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر تکلیف تو ہوئی پھر یہ روٹین بن گئی۔ آخر ایک روز میں نے سوچا کہ اگر یہی دھندہ کرنا ہے اور اسی کے عوض کمانا ہے لوگوں پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ میں فیکٹری میں کام کرکے کماتی ہوں تو پھر سیدھی طرح جسم فروشی کرکے ہی کیوں نہ کمایا جائے۔ چنانچہ میں نے دکھاوے کے لیے دفتروں میں کام شروع کیا اور اصل دھندے جسم فروشی کو اپنا لیا۔ اب پانچ چھ

سورو پے روز نہیں تو دوسرے تیسرے روز ضرور کما لیتی ہوں۔

یوں تو کراچی کی نپیئر روڈ لاہور کی ہیرا منڈی کی طرح ہی ہے لیکن پورا شہر کال گرلز سے بھرا پڑا ہے۔ اب دوسروں سے دوستی کرنا عیب نہیں رہا بلکہ فیشن ہو گیا ہے۔ چونکہ یہاں قوانین سخت ہیں اور وہ بھی غریب لوگوں کے لیے لہٰذا بہت دیکھ بھال کر چلنا پڑتا ہے۔ جبکہ فائیو سٹار ہوٹل یا امیر گھرانے کی لڑکیوں کی طرف پولیس کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرات نہیں ہوتی۔

بھارت میں طوائفوں کی یونین:

بھارت میں مختلف این جی اوز نے طوائفوں یا جسم فروش عورتوں کو سیکس ورکر کا نام دینا شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں جب بھی کوئی رپورٹ کسی ٹی وی سے دکھائی جاتی ہے جسم فروشی کرنے والی کال گرلز کو سیکس ورکر کے طور پر متعارف کرایا جاتا ہے۔ یورپ میں تو دوستی کی آڑ میں یا چلتے پھرتے کسی سے جنسی خواہش پوری کرنا کوئی عیب نہیں۔ اس طرح تھائی لینڈ، فلپائن، سنگاپور اور بھارت میں جسم فروشی عیب سے نکل کر آرٹ اور روزی کمانے کا ذریعہ بن گئی ہے حتیٰ کہ ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی اپنی مصنوعات کی فروخت کے لیے پڑھی لکھی اور فیشن ایبل لڑکیوں کو استعمال کرتی ہیں۔ ان لڑکیوں کو یہ تربیت دی جاتی ہے کہ وہ گاہک کو خوش کرنے کے لیے کچھ بھی کریں حتیٰ کہ وہ بوس و کنار تک بھی اتر آتی ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے کرتا دھرتا لڑکیوں کو کہتے ہیں کہ ان کا جسم بھی ایک پروڈکٹ ہے لہٰذا اسے فروخت کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ بھارت کیا ہر ملک میں طوائفوں کی یونین یا انجمن ضرور قائم ہو گی۔ ایک طرف تو ان کا اتفاق اور دوسرے اپنے حقوق کی حفاظت اور پولیس سے بچاؤ کے لیے بھی اکٹھا ہونا اور اجتماعی لڑائی لڑنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لاہور کی طوائفوں کی سیکرٹری یا صدر الماس بائی ہوتی تھی۔ جس نے بعدازاں مشہور سیاستدان ممتاز دولتانہ سے شادی کر لی تھی۔ اب طوائفوں کا کرتا دھرتا ماما مودا ہے جو پورے پاکستان میں مشہور ہے جبکہ ماما بشیر بھی طوائفوں

میں اتنا ہی مقبول ہے۔

بھارت میں طوائفوں کی یونین بڑی مضبوط ہے۔ پچھلے دنوں کلکتہ میں طوائفوں کی تین روزہ کانفرنس ہوئی ہے جس میں 30 ہزار سے زائد طوائفیں یا سیکس ورکر صرف کلکتہ کی رہائشی تھیں۔ اس کانفرنس کی سرپرستی بھارتی حکومت نے کی۔ (ویسے ہر سرکار کی سرپرستی طوائفوں کو حاصل ہوتی ہے) یوں تو بھارت میں سیکس ورکر کی تعداد لاکھوں تک ہے لیکن یہ باقاعدہ منظم نہیں ہیں۔ یونین کی صدر کا مطالبہ تھا کہ ہماری تنظیم کو ٹریڈ یونین کا درجہ دیا جائے تاکہ حکومت کو لاکھوں روپیہ ٹیکس کی مد میں مل سکے۔

کنجر:

طوائفیں جن خاندانوں میں پیدا ہوتی ہیں انہیں پنجابی زبان میں کنجروں کا خاندان کہتے ہیں۔ کنجر کا مطلب اس علاقہ کے لوگوں نے یہ بنا رکھا ہے کہ کن + جر = کنجر = یعنی کہ کان سے سن کر برائی جو لوگ جر (ہضم کر) سکتے ہیں انہیں کنجر کہتے ہیں۔ ان کی آگے کئی ذاتیں ہوتی ہیں۔

جسم فروشی کیا ہے؟

جسم فروشی کیا ہے اور اس کے مقاصد:

کسی بھی شخص کی جنسی ضرورت پوری کرنے کے عوض کچھ حاصل کرنے کا نام جسم فروشی ہے۔ جو عورت یا مرد اپنا جسم دوسرے انسان کو جنسی تسکین کے لیے مہیا کرتا ہے اور اس کے عوض روپیہ، تحفہ، یا کسی قسم کی دوسری ادائیگی وصول کرتا ہے اسے جسم فروشی یا کنجنی کا نام دیا جاتا ہے۔ قانونی لحاظ سے جسم فروشی اسے کہتے جس کے عوض کوئی اقتصادی مفاد اٹھایا جائے۔ عام طور پر یہ مفاد روپے یا کرنسی کی شکل میں ہوتا ہے۔ لغت کی کتابوں میں بھی بتایا گیا ہے کہ جسم فروشی چاہے کسی بھی انسان کی ہو یہ ضروری نہیں کہ عورت کی۔ لیکن تاریخ کے اوراق کھنگالے جائیں تو جسم فروشی کے زمرے میں عام طور پر عورت ہی آتی ہے۔ کیونکہ ہمارے ساجی اور اقتصادی ڈھانچے میں جسم فروشی کی تعلیم عورت ہی کو دی جاتی ہے۔ دراصل جسم فروشی عورت کا قدیم ترین پیشہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم انسان نے بھی عورت کو ایک پراپرٹی کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ دنیا کے مختلف مما لک کی مختلف تہذیبوں اور ثقافت میں عورت ہمیشہ بکتی رہی ہے۔ یہ مردوں کی تسکین کے لیے اپنا جسم بیچتی رہی اور ایسا بیسویں صدی کے آخر تک ہوتا رہا ہے۔ اور یہ بھی ہوا ہے کہ عورت نے جو کمائی حاصل کی وہ ان مردوں کے حصہ میں ہی آئی جنہوں نے انہیں اس ڈگر پر لگایا اور خود ہی ان کی نگرانی بھی کی۔ مرد بحیثیت خریدار اور گاہک کے بھی سامنے

آیا اور اسی کے دلال کی حیثیت سے بھی دیکھا گیا لیکن اس سب کو جسم فروشی یا عصمت فروشی یا Prostitution کا لفظ دیا گیا۔ جسم فروشی میں عام طور پر عورت کا نام ہی آیا جو اس سے مردوں کے لیے اشیائے ضروری کے طور پر بکتی رہی اور وہ گاہک کے روپ میں سامنے آتا رہا۔ دیکھا جائے تو عورت جسم فروشی کی طرف صرف معاشی مجبوریوں کی بنا پر آتی ہے۔

جسم فروشی قدیم زمانہ سے مختلف شکلوں میں رائج رہی ہے اور اس کی شکلوں کا انحصار اس کے اقتصادی، سماجی اور معاشرے کی جنسی اقدار پر ہوتا ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں نظر آتی ہیں یہ یا تو لادینی قوتوں اور یا پھر مذہبی قوتوں کی پناہ میں جبراً قائم رہی ہے۔ بعض معاشروں میں جسم فروشی یا جنسی تعلقات کا مقصد خاندان کی نسل بڑھانے اور اسے محفوظ رکھنے کی وجہ بھی رہا ہے۔ عام طور پر عورت معاشی مجبوریوں کے تحت جسم فروشی کرتی ہے لیکن زیادہ تر معاشروں میں اس کام کو نچلے درجے کا خیال کیا جاتا ہے کیونکہ ان کی جنسی خدمات کو اچھا نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی یہ کوئی باوقار پیشہ ہے۔ صرف چند عورتیں شادی کے ذریعے دولت اور طاقت حاصل کر سکی ہیں جیسے بازنطینی ملکہ تھیوڈرا جو کہ رومن بادشاہ جسٹائن اول کی بیوی تھی یا پھر مصر کی ملکہ قلوپطرہ جس نے اپنے حسن و جمال سے بڑے بڑوں کی نظریں خیرہ کر دی تھیں۔

صنعتی دور سے پہلے کا معاشرہ:

صنعتی دور سے قبل کے معاشرے میں جسم فروشی عروج پر تھی اور یہ کئی ملکوں میں وسیع پیمانہ پر پھیل چکی تھی۔ کئی ایک لوگوں میں اپنی بیویوں کا تبادلہ ایک فیشن سمجھا جاتا تھا۔ قدیم مشرق وسطیٰ میں اور ہندوستان کے مندروں میں جسم فروشی عروج پر تھی۔ عام عورتیں بھی مندروں میں جا کر پروہتوں کے ساتھ اختلاط کو ثواب سمجھتی تھیں ان کا خیال تھا کہ اس سے بھگوان خوش رہتا ہے اور ایسا کرنے سے ان کے ہاں طاقتور اولاد پیدا ہوتی ہے۔

قدیم یونان میں طوائفیں معاشرے کی ہر سطح پر پروان چڑھیں۔ نچلے درجے کی طوائفوں

کے قحبہ خانوں کے لیے لائسنس لینا لازمی قرار دیا گیا۔ ان پر ایک مخصوص قسم کا لباس پہننے کی بھی پابندی لگائی گئی تا کہ وہ دوسروں سے مختلف نظر آئیں اور ان کی پہچان ہو کہ وہ طوائفیں ہیں۔

قدیم روم میں بھی ان پر کئی قسم کی قانونی پابندیاں تھیں۔ رومی جب کسی ملک کو فتح کرتے تو وہاں سے جو عورتیں کنیز بنائی جاتیں انہیں قحبہ خانوں میں رکھا جاتا یا مختلف مالکان انہیں اپنے گھروں میں جنسی تسکین اور گھریلو خدمت کے لیے رکھ لیتے تھے۔

رومن حکومت نے غلام عورتوں کی جسم فروشی کو پھیلنے سے بچانے کے لیے جبری اقدامات لاگو کیے۔ قحبہ خانوں کے مالکوں کو یہ تاکید کی گئی کہ وہ ان میں رہائش پذیر طوائفوں کی زندگی بھر کے لیے رجسٹریشن کرائیں۔ انہیں ایک خاص قسم کی وگ اور مخصوص لباس اور زیورات وغیرہ پہننے کی بھی ہدایت تھی تا کہ وہ عام شہریوں کی طرح حقوق حاصل نہ کر سکیں اور مختلف نظر آئیں اس ضمن میں ان پر بھاری ٹیکس بھی عائد کیے گئے۔

کرسچین چرچ کے وسطی دور میں جب پاکیزگی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا انفرادی جسم فروشی کو بحال کرنے کی کوشش ہوئی لیکن اسے ادارہ یا قحبہ خانہ کی شکل میں آنے سے پھر بھی باز رکھا گیا۔ ان دنوں چرچ نے سینٹ آگسٹائن کی تعلیمات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان پر عمل کرنے کی کوشش کی کیونکہ ان تعلیمات کے مطابق جسم فروشی یا طوائفیں معاشرے میں بے حیائی اور غیر اخلاقی اقدار کو رواج دیتی تھیں۔ ان پر پابندی اس لیے بھی ضروری تھی تا کہ مرد شادی کے بعد دوسری عورتوں سے جنسی تعلقات استوار نہ رکھ سکے لیکن قرون وسطیٰ کے اولین سالوں میں جسم فروشی مغرب میں عروج پر نظر آتی ہے۔ اس دور میں یورپ میں لائسنس یافتہ قحبہ خانے عام ہو گئے تھے جس کی وجہ سے کر یٹ چرچوں اور سرکاری افسران کو اچھی خاصی آمدنی ہوتی تھی۔ اس کے برعکس ایشیا میں جہاں کہ عورت کو تھوڑی بہت عزت دی جاتی ہے اور جہاں مذہبی طور پر بھی سخت سزائیں مقرر تھیں جسم فروشی کو ایک فطری تقاضے کے طور پر قبول کیا گیا۔

16 ویں صدی کی درمیانی مدت میں یورپ میں جسم فروشی کو تیزی سے زوال آنا شروع ہوا جبکہ رومن اور کیتھولک فرقوں کے درمیان قتل و غارت کی فرقہ وارانہ فضا تھی تب انہوں نے اس کے خلاف کارروائیاں شروع کی۔ انہوں نے قحبہ خانوں اور ان میں رہائش پذیر طوائفوں کی مذمت کی کیونکہ انہوں نے ایک تحریک کے ذریعے کہ ان سے لوگوں کو سفلی بیماریاں لگتی ہیں خوب پراپیگنڈہ کیا ایسی بیماریاں پہلے جن کا علم نہیں ہوتا تھا۔ اس مہم کے نتیجے میں ایک خاص قانون کے تحت مقامی انتظامیہ نے اپنے علاقوں میں بہت سے قحبہ خانے جبراً بند کر دیئے۔

1635ء کو پیرس میں ایک قانون نافذ ہوا جس کے تحت جسم فروشی کی مرتکب عورتوں کے لیے کوڑوں کی سزا، سر مونڈنا یا پھر بغیر کسی مقدمہ کے عمر بھر کے لیے جلاوطنی جیسی سزائیں تجویز ہوئیں۔

صنعتی دور میں:

1635ء میں بنائے گئے سخت قوانین کے باوجود عصمت فروشی اور ناجائز جنسی تعلقات کے ذریعے پیدا ہونے والی بیماریوں کو روکا نہ جاسکا۔ بلکہ معاشرے کے ہر طبقے نے محسوس کیا کہ عصمت فروشی کی یہ بیماری پہلے سے کہیں زیادہ پھیل رہی ہے۔ اٹھارویں اور 19 ویں صدی کے دوران جب صنعتی دور کی وجہ سے شہروں میں آبادی بڑھی تو عصمت فروشی میں خاص طور پر اضافہ ہوا۔ 17 ویں صدی عیسوی میں خاص طور پر پرشیا میں جب کہ یورپ کے دیگر ملکوں کی حکومتوں نے عصمت فروشی کے ذریعے پیدا ہونے والی بیماریوں کو روکنے کے لیے سخت قانون وضع کیے اور طوائفوں کی رجسٹریشن کو لازمی قرار دیا تاکہ اس قبیح کاروبار کو دبایا جاسکے۔ اس قانون کے ذریعے قحبہ خانوں کے لیے لائسنس سسٹم اور طوائفوں کے لیے طبی معائنہ ضروری قرار دیا گیا۔

برطانیہ میں اگرچہ قحبہ خانوں یا عصمت فروشی کے لیے لائسنس ضروری نہیں تھا لیکن

وہاں بھی جنسی امراض کو روکنے کے لیے 1860ء میں ایک قانون نافذ ہوا جس کے تحت آرمی اور نیوی کے علاقوں میں موجود طوائفوں کے لیے طبی معائنہ لازمی قرار دیا گیا۔ برطانیہ اور امریکہ میں عصمت فروشی ریڈ لائٹ ایریا (چکلوں وغیرہ) میں بڑی تیزی سے پھیلی پھولی لیکن شہری حکام نے اس پیشہ کو ضروری برائی خیال کرتے ہوئے معزز لوگوں پر اس ایریا میں جانے پر پابندی لگا دی۔ پھر گوری چمڑی والی عورتوں اور لڑکیوں کو تجارتی سطح پر بحری جہازوں کے ذریعے دوسرے ملکوں میں بھی اسی مقصد کے لیے لے جایا جانے لگا۔ اس کے خلاف اور لائسنس یافتہ طوائفوں کے تدارک کے لیے پورے یورپ میں احتجاج بلند ہوا۔ برطانیہ نے جنسی بیماریاں روکنے کے لیے قانون بنایا لیکن یہ قانون عام بیماریوں پر بھی لاگو ہوتا تھا۔ بہت سی حکومتوں نے عورتوں اور بچوں کے دوسرے ملکوں میں سمگل کرنے کے بارے میں بھی پابندیاں عائد کیں اور اس کے لیے قوانین بنائے گئے۔ برطانیہ نے 1885ء میں کریمنل امنڈمینٹ ایکٹ نافذ کیا۔ 1904ء میں اسی مقصد کے لیے ایک انٹرنیشنل اینٹی ہیومن سمگلنگ ایکٹ عورتوں کی سمگلنگ روکنے کے لیے بنا۔

امریکہ میں عصمت فروشی:

امریکہ میں عصمت فروشی ان آبادکاروں کے ساتھ ہی آ گئی تھا جو آئرلینڈ یا برطانیہ کے مختلف شہروں سے وہاں آئے تھے۔ 1910ء میں مذہبی اور سماجی تنظیموں نے طوائفوں کی غیر اخلاقی حرکات اور جنسی روابط کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے امراض کو مدنظر رکھتے ہوئے ملکی سطح پر ایک وسیع اور جامع مہم شروع کی۔ چنانچہ وفاقی سطح پر کانگرس نے وائٹ سلیوٹریفک ایکٹ (White Slave Traffic Act 1910) منظور کیا جس کے تحت عصمت فروشی کے لیے کسی عورت یا لڑکی کا دوسری جگہ یا دوسرے ملک سے آنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ مقامی سطح پھر بھی عصمت فروشی اور طوائفوں کے خلاف لاتعداد قوانین منظور ہوئے۔ بعض قوانین طوائفوں کی

بحالی اور انہیں اس پیشے سے منسلک کرنے والے افراد سے تحفظ کے بارے میں تھے جبکہ بعض قوانین طوائفوں کو گمراہ کرنے والوں یا ان کی غلط رہنمائی کرنے والوں کے خلاف تھے۔اس کے علاوہ بعض قوانین انسانوں کے احساس کمتری یا ذہنی پستی کی وجہ سے اخلاقی اقدار پامال کرنے والوں کے خلاف تھے۔اگرچہ یہ قوانین اب تک لاگو ہیں اور آخری قانون چند سال قبل ہی لاگو ہوا ہے لیکن اس کے باوجود عصمت فروشی ماضی کی نسبت آج کہیں زیادہ عزوج پر ہے۔

بیسویں صدی کے آخر تک امریکہ میں عصمت فروشی مختلف شکلوں میں موجود رہی۔بعض طوائفوں یا کال گرلز نے عصمت فروشی کے لیے نئے نئے ڈھنگ اختیار کیے۔کسی مشہور و معروف قحبہ خانے کے بجائے انہوں نے اپنے ذاتی فلیٹ یا اپارٹمنٹس لیے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے مستقل گاہوں کی لسٹ بھی ترتیب دی ہوئی تھی۔بعض طوائفوں نے قدیم روایات کو اپنا رکھا تھا اور بعض نے تفریح کے لیے مخصوص علاقے منتخب کر رکھے تھے۔لاس ویگاس،فلوریڈا جہاں ان کی مانگ اب بھی عروج پر ہے بعض لڑکیاں نام نہاد مساج پارلر میں بھی کام کرتی ہیں جو کہ قدیم قحبہ خانوں کی ایک نئی شکل ہے۔امریکہ میں کال گرلز کی اکثریت بازاروں،سڑکوں اور گلیوں میں گھوم کر گاہک تلاش کرتی ہے۔ان کال گرلز کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ان کی کوشش ہوتی ہے کہ قانون کی نظر سے کسی نہ کسی طرح بچا جائے اس کے باوجود ہر سال امریکہ میں عصمت فروشی کے ضمن میں لاتعداد لڑکیاں گرفتار بھی ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان پر الزام آوارہ گردی ہی کا لگتا ہے لیکن گاہک شاذ و نادر ہی گرفت میں آتا ہے۔

عصمت فروشی پر امریکی آراء:

امریکہ میں 1960ء تک عصمت فروشی کے بارے میں کرسچین جیوڈو قانون کے تحت فیصلے ہوتے تھے اور دیگر غیر اخلاقی حرکات کے لیے بھی یہی قانونی طریقہ کار استعمال ہوتا تھا۔لیکن

حال ہی میں اس بارے میں تحقیق کرنے والوں نے کوشش کی ہے کہ دیگر اخلاقی اقدار کو عصمت فروشی سے الگ رکھا جائے اس سلسلہ میں وہ تین نکات پر زور دیتے ہیں:

1- عصمت فروشی کا تعلق منظم جرائم سے ہے۔

2- عصمت فروشی دیگر جرائم کی بھی وجہ بنتی ہے۔

3- عصمت فروشی کی وجہ سے جنسی امراض ایک فرد سے دوسرے کو منتقل ہونے کا باعث بھی بنتے ہیں۔

امریکہ میں ایک طبقہ کا یہ کہنا بھی ہے کہ باقاعدہ پیشہ ور عورتوں کی نسبت سوزاک، آتشک اور ایڈز جیسے امراض عام نوجوان لڑکے لڑکیوں کے جنسی ملاپ سے زیادہ بڑھتے ہیں جو کہ طالب علم ہیں یا شوقیہ محض تفریح طبع کی خاطر کلبوں اور پارکوں میں جنسی اختلاط کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طبقہ عصمت فروشی کو قانونی حیثیت دینے کے حق میں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسے پولیس کی دسترس حاصل نہ ہو کیونکہ یہ کوئی خوفناک اور دوسرے کے لیے عذاب کا باعث بننے والا کرائم نہیں ہے۔ اس کے حق میں امریکہ کی نصف آبادی ہے۔ اس آبادی کا کہنا ہے کہ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے اس سے دوسرے کو نقصان نہیں پہنچتا لہٰذا اسے جرائم کی فہرست سے خارج کیا جائے۔ 1980ء میں جسم فروشی کو ایڈز کا باعث قرار دیا گیا لیکن بعد ازاں پتہ چلا کہ یہ مرض بچوں کو بھی ہو رہا ہے۔

✿

برصغیر میں پہلا چکلہ

ہندوستان میں عیش ونشاط کے لیے مخصوص علاقے قائم کرنے کا سہرا مسلمان بادشاہ محمد تغلق کے سر ہے جب اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ایک ہی چکلہ طرب آباد کے نام سے قائم کیا۔ اس جگہ پر عیاشی کرنے والوں کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوتی تھی۔ اسکے بعد مغل شہنشاہ اکبر نے اس کو عام کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس نے آگرہ میں ''شیطان پورہ'' کے نام سے ایک الگ شہر بسایا۔ شہنشاہ اکبر خود بھی عیاش آدمی تھا اس کی یوں تو بیوی جودھا بائی تھی لیکن اس نے حرم میں باقاعدہ نکاح کر کے 62 بیویاں رکھی ہوئی تھیں۔ میرا خیال ہے ان کے ناموں کا بھی کسی کو پتہ نہ ہوگا۔ اکبر کی طرح ہر مغل بادشاہ نے لاتعداد شادیاں کی تھیں۔ بہادر شاہ ظفر کی بھی لاتعداد بیویاں تھیں اور بیچارا محمد شاہ رنگیلا تو یوں ہی بدنام ہے۔ دراصل وہ بیوقوف بادشاہ تھا جو اپنی عیاشی کے پراپیگنڈا کو روک نہ سکا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انارکلی بھی ایک رقاصہ تھی جس پر اکبر فریفتہ تھا اور جب اس نے اپنے بیٹے شہزادہ جہانگیر کو اس سے محبت کرتے دیکھا تو اسے دیوار میں چنا دیا تھا۔ انارکلی کا مقبرہ اکبر کے مرنے کے بعد جہانگیر نے ہی تعمیر کرایا تھا اور اس کے اردگرد ایک خوبصورت باغ بھی بنوا دیا تھا۔

مغلوں کے بعد شجاع الدولہ اور واجد علی شاہ نے لکھنؤ میں طوائف آباد کے نام سے مخصوص شہر قائم کیا۔ اس شہر میں طوائفیں بھری پڑی تھیں اور ہر طوائف بازار میں آنے والے کو کھڑکی یا دروازے سے خوش آمدید کہتی تھی۔ دروازے پر ہی مول تول طے ہو جاتا تھا۔ محمد شاہ

رنگیلا کے دور میں تو کام بہت بڑھا جبکہ آ جکل کوئی بھی حکمران محمد شاہ رنگیلا سے کم نہیں ہے۔ بڑے عرصہ بعد جنرل یحییٰ خان کا نام سننے میں آیا تھا۔ جنرل یحییٰ خان شراب اور شباب کا اس قدر رسیا تھا کہ بعض خالص گانے اور رقص کرنے والی طوائفیں بھی ان سے گھبراتی تھی مبادا وہ رات کو اسے بستر کی زینت ہی نہ بنادے۔

ہندو مہاراجے اور ان کا حرم:

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے بہت سے راجے مہاراجے اور نواب ایسے بھی تھے جو بیک وقت بیٹی اور ماں سے تعلق رکھتے تھے بلکہ ان کو شادیاں کرنے میں بھی کسی طرح رکاوٹ نہیں ہوتی تھی بلکہ جو عورت بھی خوبصورت ہوتی اسے حرم میں داخل کر لیتے ان پر مذہب یا خاندان کی بھی قید نہیں ہوتی تھی۔ مہاراجوں کے زنان خانوں میں سینکڑوں کی تعداد میں ان کی بیویاں، باندیاں، نوکرانیاں موجود ہوتی تھیں۔ اکثر کے نام بھی انہیں معلوم نہیں ہوتے تھے۔ راجپوتانہ (راجھستان) کے ایک مہاراجہ جب فوت ہوئے تو ان کے حرم خانہ میں 4 ہزار عورتیں موجود تھیں۔ بعض راجوں کے ساتھ تو ان کی بیویوں کو ستی بھی کر دیا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے ان کی بیواؤں کو دودھ میں افیون ملا کر پلا دی جاتی تھی اور ستی کی رسم ادا کر دی جاتی تھی۔ مہاراجوں کے لیے نابالغ لڑکیاں بھی حرم میں رکھ دی جاتی تھیں۔

ہندو مہاراجوں کی طرح مسلمان بادشاہ بھی کچھ کم نہ تھے متوکل کے پاس چار سو کنیزیں تھیں۔ ہارون رشید کے پاس دو ہزار کنیزیں جن میں سے تین سو باہر سے آنے والے مہمانوں کی خدمت کے لیے وقف تھیں۔ ہارون رشید عورتوں کو جانچنے اور پرکھنے میں کافی ماہر تھا۔ اس نے ایک کنیز کی حاضر جوابی اور عقل مندی کی وجہ سے ایک ہزار دینار میں خریدا تھا۔ اس کا سگا بیٹا مامون رشید بھی عورتوں کا رسیا تھا اس نے علی ابن ہشام کی کنیز کو پسند کیا اس کے انکار پر اس کو انہوں نے جہنم واصل کر دیا۔

عورت بطور ذاتی ملکیت:

16 ویں صدی عیسوی تک مرد عورت کو ذاتی ملکیت تصور کرتا تھا عورتوں کو کڑے پہرے میں رکھا جاتا۔ اسے آگ میں جھونک دیا جاتا تاکہ دوسرے اس کی شکل نہ دیکھ سکیں پھر بعض لوگ جاتے وقت عورتوں کو لوہے کا لنگوٹ باندھ کر تالا لگا جاتے تاکہ وہ کسی اور مرد کو نہ مل سکے۔

16 ویں صدی تک عورت مختلف آزمائشوں سے گزرتی رہی۔ اس پر پابندیاں لگانے والے مرد خود اس پابندی سے آزاد رہے۔ اس صدی کے آخر تک یہ ضرور ہوا کہ مردوں کے ہاتھوں بکنے کی بجائے عورت ایک مرد کی زوجیت میں آ گئی۔ اس کے باوجود اس کے حالات بہتر نہ ہو سکے اور وہ ذہنی طور پر مرد کی مطلق غلام رہی۔

قدیم دور میں مرد جنس اور مذہب میں کوئی زیادہ فرق نہیں دیکھتے تھے۔ دراصل عصمت فروشی نے قدیم زمانے میں عبادت گاہوں کے اندر جنم لیا۔ جہاں پنڈت مذہب کے نام پر داسیوں کی عزتوں کو نوچتے رہے۔ وہ ہندو دھرم کی خدمت کے لیے چن چن کر خوب صورت لڑکیوں کو اکٹھا کرتے اور ان کے ماں باپ کو بتاتے کہ ان کی بیٹیاں دیوتا کی خدمت کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔ کچھ مخصوص دنوں میں دیوتا کو راضی کرنے لیے کسی حسین و جمیل لڑکی کی قربانی بھی دراصل ہوس کا ایک بہانا ہوتا تھا۔ لڑکی کو بڑے چاؤ مگر زبردستی چھین کر دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا۔ اکثر اوقات لڑکیاں پنڈتوں کے ہتھے چڑھ جاتیں جو ان سے اپنی ہوس پوری کرتے رہتے۔ انجان لوگ خوش ہوتے رہتے کہ ان کی بیٹی نے دیوتا کو خوش کر دیا ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے جب سومنات پر حملہ کیا تو وہاں ایسی ہی لڑکیاں برآمد ہوئیں جنہیں زبردستی داسیاں بنا کر رکھا گیا تھا مگر درحقیقت وہ پنڈتوں کے زیر استعمال تھیں۔

نوآبادیاتی دور میں چکلے:

1845ء میں چارلس نیپئر نے سندھ کو فتح کیا تو اس نے کراچی میں دو ''چکلے'' قائم کیے ان میں سے ایک ''زنانہ'' تھا اور دوسرا ''مردانہ''۔ انگریزوں نے برصغیر کو تاراج کرنے کے بعد راستے میں آنے والے علاقوں میں بے شمار چکلے قائم کیے جن کا مقصد جنگ و جدل سے تھکے ہارے فوجیوں کی آسودگی کا سامان مہیا کرنا تھا۔ 1857ء میں سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوا اس کے بعد حرموں سے نکلنے والی ہزاروں عورتوں کے مستقبل کا سوال سامنے آیا۔ بعض عورتوں نے مختلف انگریز فوجیوں اور سپاہیوں سے شادیاں رچالیں اور گھروں میں دبک گئیں۔ جبکہ بعض کو ہندو مہاراجے لے اڑے، کچھ بچی جانے والی اور خوبصورت عورتوں نے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے خود میدان میں آنے کا فیصلہ کیا۔ دراصل مغل اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے اور ان کی ان درباری عورتوں کو اس تعیش کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ ان درباری ناچ گانے والیوں نے نئی انارکلی، پرانی انارکلی سے لے پیسہ اخبار تک مفت مکانات حاصل کئے اور یہاں پر رقص و سرور کی محافل کا آغاز ہوا۔ وہ جہاں بیٹھتیں وہاں ماضی کے قصے چھیڑ لیتیں۔ مغل بادشاہوں کی حسن پرستی اور اپنی دلفریب اداؤں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ رنجیت سنگھ کے دور میں اس وقت کی میونسپل کارپوریشن نے شکایت کی کہ ان عورتوں کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔ رنجیت سنگھ کے حکم پر انہیں وہاں سے اٹھا کر ٹکسالی گیٹ کے موجودہ علاقے میں منتقل کر دیا گیا۔ دراصل انہیں اور زیادہ دور بھیجا جا سکتا تھا مگر اس وقت کی نوکر شاہی انہیں زیادہ دور بھیجنے کے حق میں نہیں تھی کیونکہ ان کی تمام راتیں ان کی چوکھٹوں پر کٹتی تھیں۔ یہاں منتقل ہونے کے بعد انہیں زیادہ آزادی ملی۔ اس وقت زیادہ طوائفیں پیر مکی، چیت رام روڈ، بازار شیخوپوریاں، بازار ککھنی ملاں خاں اور ٹبی گلی کے اندر رہتی تھیں۔

دیوداسیاں

دیوداسی کالفظی مفہوم ''خدایا دیوتا کی باندی'' کے ہیں۔ ہندو مذہب میں غریب گھرانے کی لڑکیوں کو ان کے والدین سن بلوغت سے قبل ہی کسی نہ کسی مندر میں دیوداسی بنا کر بھیج دیتے ہیں۔اس کو جب پہلی ماہواری آتی ہے تو اس کے بعد اس کو کسی امیر آدمی کی رکھیل بنا دیا جاتا ہے۔عام طور پر پرہتوں کے پاس امیر لوگ آتے ہیں اور لڑکیوں کو ثواب کا جھانسا دے کر ان سے جنسی روابط پر مجبور کیا جاتا ہے۔ دیوداسیاں چونکہ غریب گھرانے کی ہوتی ہیں اس لیے وہ پیٹ کا دوزخ بھرنے اور ثواب کمانے کے چکر میں مندروں میں پروہتوں کے کہنے پر جنسی خدمت کرتی رہتی ہیں۔ دیوداسیاں ہمیشہ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والوں کی بیٹیاں ہوتی ہیں لہٰذا وہ مجبور ہوتی ہیں۔

ہندوستان پر جب برطانوی راج مسلط ہوا تو انہوں نے مندروں' شوالوں اور دیگر عبادت والی جگہوں پر دیوداسیاں رکھنا قابل جرم قرار دے دیا اور اس سلسلہ میں سخت قوانین کا نفاذ کیا لیکن اس کے باوجود دیوداسیوں کا وجود اب تک قائم ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد کانگرس گورنمنٹ نے بھی دیوداسیوں کے بارے میں سخت ایکشن لیا اور اسے ممنوع قرار دے دیا لیکن جنوبی ہندوستان میں پروہتوں کی نگرانی میں دیوداسیوں کا سلسلہ اب بھی موجود ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ایسا ہزاروں برس سے ہو رہا ہے لہٰذا ہم اس مذہبی رسوم کے خلاف نہیں ہو سکتے۔

اس نام نہاد مذہبی مافوق الفطرت اور قدیم رسم کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے جنوبی ہندوستان میں 1936ء میں ایک مصنف رمامیرتھامل نے ایک کتاب داس گال موں والائی (Valley of Deceit) کے نام سے لکھی جس میں سماج کی اصلاح کے بارے میں باتیں بتائی گئیں۔اس کا مقصد برہمن ازم کی اس برائی کا خاتمہ کرنا بھی تھا۔

جنوبی ہندوستان کی کئی تنظیموں اور ان میں کام کرنے والی لڑکیوں نے اس بارے میں مسلسل لکھا اور احتجاج بھی کیا لیکن بات بنی نہیں۔رمامیرتھامل کی کتاب میں زمینداری نظام کو اس برائی کی سرپرستی کرتے دکھایا گیا ہے کیونکہ عیاشی کی ضرورت اس اپر کلاس کو ہوتی ہے۔اس علاقے میں دیوداسیوں کو نہ صرف جنسی خدمت بلکہ شادیوں میں رقص اور موت کے وقت بین ڈالنے کے لیے بلایا جاتا ہے۔ بھارت کے ہدایت کار گلزار نے بین ڈالنے والی دیوداسیوں کے بارے میں ایک فلم ''رودالی'' کے نام سے بنائی ہے جس میں ان دیوداسیوں کے مختلف کاموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دیوداسی کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ مستقل طور پر مندر کے لیے وقف رہے اور جو بھی حکم یا ہدایت اس مندر کا پجاری دے اس پر سر تسلیم خم کرنا ضروری ہے۔اگر اس دوران دیوداسی حاملہ ہو جائے تو پھر بچے کا کیا بنتا ہے؟ اس سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ دیوداسی کو کسی گھر میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔اگر بیٹی ہو تو اس کو پھر دیوداسی کے گھر والے ہی پالتے ہیں اور لڑکا ہو تو وہ برہمنوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے کہ وہ اس کو پالیں۔عام طور پر برہمنوں اور دیوداسیوں کے والدین کے گھر قریب ہی ہوتے ہیں۔جنوبی ہندوستان کی بعض این جی اوز نے اس قبیح رسم کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا لیکن وہ اس میں پورے نہیں اتر سکے کیونکہ اکثر لوگ دیوتاؤں کو ناراض نہیں کرنا چاہتے لیکن بعض لوگوں نے اپنی بیٹیوں کو مندروں میں دیوداسیاں بننے سے روکا بھی ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ دیوداسی جب بیٹی کو جنم دیتی ہے تو دیوداسی کا خاندان ہی اس کو پالتا ہے اور اپنی بیٹیاں بنا لیتا ہے۔ اس سلسلہ میں انہیں جاگیرداروں نے زمین کا کوئی نہ کوئی قطعہ دیا ہوتا ہے جس سے وہ پیٹ پالتے ہیں اس میں

جائیداد، نام، تعلیم بھی شامل ہے۔ اکبر کے زمانے میں اکبر کے نورتنوں اور بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے دیوداسیاں خدمت کے لیے تیار رہتی تھیں۔

جن مندروں میں دیوداسیاں موجود ہوتی ہیں ان کے ساتھ اراضی کے قطعات بھی ہوتے ہیں جن سے مندر کے پروہتوں، پنڈتوں اور دیوداسیوں کے اخراجات چلتے ہیں۔ برطانوی راج کے دوران اور اب ہند میں بھی ان دیوداسیوں اور جسم فروشی کے انسداد کے لیے قانون حرکت میں آئے لیکن جب روایات اور مذہب آڑے آیا تو قانون میں بھی نرمی آئی۔ اس کے باوجود روشن خیال ہندو اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ دنیا چونکہ قریب تر ہوتی جا رہی ہے لہٰذا جاگرتی کی تحریکوں کو مزید مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔

ہیجڑے

لاہور کی ہیرامنڈی قبل ازیں لنڈا بازار، انارکلی، لوہاری گیٹ کے اندر سوتر منڈی اور اس سے آگے سید مٹھہ تک بنتی اور اجڑتی رہی ہے۔ اس جگہ کا نام چوک چکلہ مشہور تھا اور یہاں طوائفیں باقاعدہ بیٹھا کرتی تھیں۔ پھر یہ دھندہ آگے بڑھتا بڑھتا موجودہ جگہ پر آ گیا جسے ہیرامنڈی کا نام دیا گیا اور اسے شاہی محلہ بھی کہا جانے لگا لیکن اب ہیرامنڈی اجڑتی جا رہی ہے۔ 60 فیصد طوائفیں پوش علاقوں میں جا چکی ہیں اور ان کے جو مکانات خالی ہوئے ہیں وہاں ہیجڑوں اور خواجہ سراؤں نے ڈیرے جما لیے ہیں کیونکہ ان عمارتوں کو شرفاء نے خریدنے سے انکار کر دیا اور اس بدنام جگہ کو ہیجڑوں نے ہی آماجگاہ بنایا وہ اس لیے بھی کہ طوائفوں کو ان کی شکل میں اچھے گاہک مل گئے۔ 90 کے شروع میں ہیجڑوں نے بازار حسن کا رخ کیا اور انہوں نے گندے اور تاریک کمرے کرائے پر لے کر رہائشیں اختیار کی۔ یہ ہیجڑے لاہور کی نواحی آبادیوں سے آئے کیونکہ ٹی وی وغیرہ نے ان کی ضرورت اور قدر کم کر دی۔ دیہات میں یا پھر شہروں میں ہیجڑے شادی بیاہ اور بچوں کی پیدائش کے موقع پر ناچ گانے سے پیٹ پالتے تھے لیکن جدید ذرائع ابلاغ کی وجہ سے ان کی اہمیت کم ہو گئی اور لوگوں نے بے ہنگم ناچ اور بھدی آواز میں گانے والوں کو گھاس ڈالنا کم کر دیا اور ہیجڑوں نے اس بازار میں آ کر جسم فروشی شروع کر دی۔

ہیجڑے، خواجہ سرا، زنانے یا یہ تیسری مخلوق کا آغاز کب ہوا اس کے بارے میں وثوق سے

کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اولین انسان کے ساتھ ہی پیدائشی طور پر جنسی خامی کے ساتھ پیدا ہونے والے بچوں کا سلسلہ شروع ہو گیا کیونکہ یہ قدرت کا کھیل ہے اور انسان کا اس میں بس نہیں چلتا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے مطابق زمانہ قدیم میں وسطی ایشیا اور چین میں ہیجڑوں کو چوکیدار اور گھریلو ملازم کے طور پر رکھا جاتا تھا کیونکہ زنان خانوں میں مردوں کا داخلہ ممنوع ہوتا تھا۔ عام طور پر بادشاہ، مہاراجے اور شرفاء کے طبقے کے لوگ گھروں میں ہیجڑوں کو ہی رکھتے تھے۔ مغلیہ دور میں خواجہ سرا بیگمات کی خدمات پر معمور ہوتے تھے وہ بادشاہ سلامت کا پیغام زنان خانہ میں پہنچاتے تھے۔ اودھ کے نوابوں نے بھی محل میں خواجہ سرا رکھے ہوتے تھے۔ جان عالم واجد علی شاہ نے تو خواجہ سراؤں کی ایک فوج رکھی ہوئی تھی جن کی وردی عورتوں کا لباس تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کا یہ کام ختم ہوا تو انہوں نے گانے بجانے کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ یہ ہیجڑے دنیا کے ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ میں گے کلب (Guay Club) ان ہی زنانوں کے ہیں۔ لائل پور (فیصل آباد) کے افتخار افتی ان ہیجڑوں کے صدر ہیں۔ افتخار اب بوڑھا ہو گیا ہے اور اس نے عورتوں کے زیور پہننے چھوڑ دیئے ہیں البتہ شروع سے اس نے اپنا شوہر ایک سکھ کو رکھا ہوا تھا جو ہر اتوار باقاعدگی سے اس کے گھر آتا تھا اور اس کی جنسی خواہش پوری کرتا تھا۔

میرے ایک دوست کا چھوٹا بھائی رقص کا رسیا ہو گیا۔ اس نے بڑی محنت سے رقص سیکھا کئی ایک ملکوں کے دورے بھی کیے۔ انعامات بھی حاصل کیے لیکن وہ رہتا فورٹ روڈ پر تھا جس کی پچھلی گلی میں ہیجڑوں کے ڈیرے تھے۔ اسے رقص کا ماہر دیکھ کر انہوں نے اس نوجوان کے پاس آنا شروع کر دیا اور دوستی پیدا کر لی۔ اس دوستی کی آڑ میں ایک ہیجڑے نے اسے قتل کیا۔ قتل اس نے اس طریقہ سے کیا تھا کہ پتہ نہ چل سکے۔ اس نے اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر دبا دیا اور اس وقت چھوڑا جب اس کی سانس بند ہو چکی تھی۔ وہ اندر ہی لیٹا رہ گیا اور قاتل بھاگ گیا۔ چند روز وہ مردہ حالت میں ہی اندر پڑا رہا۔ نیچے کے پورشن میں رہنے والوں نے اس کے بھائی

بندں کو اطلاع دی کہ اوپر باتھ روم میں کئی روز سے نلکہ کھلا ہے اور بند نہیں کیا جا رہا اور اندر سے بدبو بھی آنا شروع ہوگئی ہے۔ اس پر دروازہ توڑا گیا تو اندر وہ مردہ حالت میں پڑا تھا۔ پولیس نے مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کی آخر ایک ہیجڑا پکڑا گیا۔ اب وہ جیل میں ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ ہیجڑوں نے آجکل ہیرا منڈی کو اپنی آماجگاہ بنایا ہوا ہے۔ جہاں تک لاہور شہر کا تعلق ہے اس میں دس ہزار سے زائد ہیجڑے رہتے ہیں۔ سب سے زیادہ تعداد ہیرا منڈی میں ہے۔ جبکہ اس سے کم تعداد میں شاہ نور سٹوڈیوز، سمن آباد، مزنگ اور دیگر علاقوں میں ہیں۔ ایک زمانہ میں ہیجڑوں کا ایک گرو قلعہ گوجر سنگھ میں بھی رہا کرتا تھا۔ وہ یہاں سے یا تو کہیں دور چلا گیا یا پھر فوت ہوگیا۔ دیگر ذاتوں کی طرح ہیجڑوں کی بھی تین اقسام ہیں:

ہیجڑوں کی ذاتیں:

(1) مورت (2) زنانے (3) شیطان یا دھندا گیر یا نربان۔

مورت:

مورت وہ ہیں جو قدرتی طور پر نامرد ہوتے ہیں۔ انہیں ہیجڑوں میں سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ وہ عورتوں کی طرح رہتے ہیں، ان ہی کی طرح کپڑے پہنتے اور بناؤ سنگھار کرتے ہیں۔

زنانے:

جہاں تک زنانوں کا تعلق ہے یہ قدرتی طور پر جنسی حوالے سے محروم نہیں ہوتے بلکہ بعض تو مرد ہی ہوتے ہیں لیکن انہیں عورتوں کی طرح بات کرنا اچھا لگتا ہے۔ بعض اوقات وہ لیڈی ڈریس بھی پہن لیتے ہیں اور میک اپ بھی کر لیتے ہیں۔

شیطان یا دھندا گیر (نربان):

تیسری قسم شیطان کی ہے انہوں نے خود کو مورت کی شکل میں ڈھالا ہوتا ہے۔ وہ جنسی لحاظ سے ٹھیک ہوتے ہیں لیکن آپریشن کے ذریعے خود کو ہیجڑا یا خواجہ سرا بنایا ہوتا ہے انہیں مقامی زبان میں نربان بھی کہتے ہیں۔ دھنداگیروں کو ہیجڑوں کی دنیا میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان میں جنسی طور پر محروم جنسی لحاظ سے درست زنانے بھی ہوتے ہیں اور یہ زیادہ تر جنس فروش ہوتے ہیں۔

تیسری قسم کی مخلوق کو جب جنسی طور پر ہیجڑے بنایا جاتا ہے تو ان کا آپریشن بڑا پیچیدہ ہوتا ہے اور اس کے ڈاکٹر بہت زیادہ پیسے لیتے ہیں۔ کیونکہ غیر قانونی آبارشن کی طرح یہ بھی غیر قانونی کام ہے۔ اس قسم کے آپریشن لاہوری (لوہاری) گیٹ، مزنگ، قینچی، چونگی امرسدھو اور کاموں کے میں کیے جاتے ہیں۔ اس آپریشن کی فیس 15 سے 20 ہزار تک ہے اور بات کے پانچ ہزار اس سے الگ ہوتے ہیں۔

بعض ہیجڑے اپنی چھاتیاں (بریسٹ) بڑی کرنے کے لیے ہارمونز کے انجکشن بھی لگاتے ہیں یا پھر واٹر بال استعمال کرتے ہیں۔ ہیجڑوں کی دو ذاتیں ہیں (1) مرضائی (2) چاندنی۔

مرضائی ذات کے زیادہ تر ہیجڑے ہیرا منڈی میں برسوں سے رہائش پذیر ہیں جبکہ چاندنی ذات کے ہیجڑوں کو غیر (Out Sider) سمجھا جاتا ہے۔ مرضائی مغل بادشاہوں کے زمانے کے خواجہ سراؤں کی اولاد سمجھے جاتے ہیں اور انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لاہور کے مشہور ہیجڑوں میں ہاشمہ، صائمہ، گوگی، کومل، عاشی، سلیم، گھوڑا، ریما جان اور مہوش قابل ذکر ہیں۔ ہیجڑوں کی شادیاں بھی ہوتی ہیں شادی کی رسم ان میں بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ شادی کی خواہش عام طور پر انہیں چاہنے والے ان کا مجرا دیکھ کر کرتے ہیں اور انہیں

مستقل طور پر طوائفوں کی طرح داشتہ رکھ لیتے ہیں۔

ہیجڑے شادی سے قبل باقاعدہ گرو کا مشورہ لیتے ہیں۔ پھر شادی کی رسم ہیجڑے کے گھر میں ادا کی جاتی ہے جس میں اس کی تمام سہیلیاں شرکت کرتی ہیں۔ اس موقع پر مٹھائی بانٹی جاتی ہے۔ گرو مٹھائی کی ایک ڈلی اٹھاتا ہے اور ہیجڑے اور اس کے شوہر کو باری باری کھلاتا ہے جبکہ دیگر ہیجڑے رقص کی محفل گرماتے ہیں۔ رقص کے دوران ان پر پھولوں اور پیسوں کی بارش ہوتی ہے۔ دلہن کو سرخ غرارے والا جوڑا اور سونے کے زیور پہنائے جاتے ہیں جو کہ ہونے والا شوہر ساتھ لاتا ہے۔ گرو دولہا کا ہاتھ دلہن کے ہاتھ میں دیتا ہے اور یہ الفاظ دہراتا ہے ''حقے تے حقہ بندہ تجھے قبول'' دولہا اور دلہن تین مرتبہ دہراتے ہیں قبول، قبول، قبول۔ اس طرح شادی پکی ہو جاتی ہے۔ حقے تے حقہ ایک پرانا فقرہ ہے جو اس محاورے سے لیا گیا ہے۔ ''حقہ کرے گڑ گڑ تے چلم سڑائے'' جس کا مطلب ہے کہ جنسی ملاپ ہو گیا ہے۔ پھر برات دولہا کے گھر جاتی ہے جہاں دولہا دلہن کی انگلی میں انگوٹھی پہناتا ہے۔ اگر کوئی ہیجڑا مر جاتا ہے تو دوسرے اس کے جنازے میں شامل نہیں ہوتے بلکہ اس کی عورت والی نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہے۔ بعض ہیجڑے باقاعدہ نماز بھی پڑھتے ہیں لیکن وہ اس مقصد کے لیے مسجد نہیں جاتے۔ طوائفوں کی طرح ہیجڑوں کی بھی مخصوص بولی ہوتی ہے جو وہ اپنے بزنس کے دوران استعمال کرتے ہیں۔ ان کی زبان بھی تماش بینوں کی سمجھ سے باہر ہوتی ہے۔ ان کی زبان میں فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال ہوتے ہیں ''کارے کارو بیلہ ہے گا'' (اس کی طرف مت دیکھو بندہ کرخت مزاج ہے) بعض ہیجڑے غریب لڑکوں کو پھسلاتے ہیں ان سے جنسی روابط رکھتے ہیں اور ان کی مدد بھی کرتے ہیں۔

ہیجڑے مقامی ثقافت کا حصہ بھی ہیں وہ شادی بیاہ اور بچے کی پیدائش کے موقع پر گیت بھی گاتے ہیں۔ لوگ ان کی اس بات سے بھی ڈرتے ہیں کہ ان کی دعا اور بددعا بڑی جلدی قبول ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی بددعا لینے کو کوئی تیار نہیں ہوتا اور انہیں اس طریقہ سے

خیرات ملتی رہتی ہے۔

یہ لوگ اس وجہ سے بھی معصوم اور بے ضرر ہیں کہ انہیں معاشرے نے کوئی مقام نہیں دیا حتیٰ کہ ان کو قبول بھی نہیں کیا۔ ہیجڑے عام طور پر صوفیا کے مزاروں پر جا کر بھی ناچتے ہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار پر بھارت اور پاکستان کے لاتعداد ہیجڑے جا کر رقص کرتے ہیں اور مرادیں مانگتے ہیں۔

ہیجڑوں سے ٹیکس وصولی کا کام

بھارت میں اب ہیجڑوں سے انکم ٹیکس وصولی کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ ہیجڑوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اگر کسی کے پیچھے پڑ جائیں تو رقم وصول کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ پاکستان میں بھی عدالت عالیہ نے الیکشن کمیشن کو حکم دیا ہے کہ ان کا ووٹروں کی لسٹ میں اندراج کیا جائے۔ اور ان سے ٹیکس وصول کرنے کا کام بھی لیا جائے۔ اس اعلان پر تمام ہیجڑوں نے بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔

شاہی محلّہ

گانے بجانے اور آرٹ سیکھنے کی آڑ میں جسم فروشی کے دھندے نے عروج پکڑا تو ایک وقت کی روٹی کے لیے ترسنے والی طوائفوں کے پاس اچھا خاصا روپیہ آ گیا۔ انہوں نے اس دولت سے یہاں اپنے لیے مکانات خرید لیے اور بعد ازاں اس علاقے کو خود ہی شاہی محلے کے نام سے مشہور کر دیا (یعنی کہ شاہی خاندان کے خاص مہمانوں کا علاقہ)۔ رنجیت سنگھ ہی کے دور میں طوائفوں کی تعداد اور وہاں آنے والے تماش بینوں کے اعتبار سے پورے برصغیر میں پہلے نمبر پر کلکتہ، دوسرے پر بنگلور اور تیسرے پر ممبئی تھا جبکہ لاہور کو ہیرا منڈیوں کے ان مقابلوں میں چوتھا نمبر ہی حاصل رہا۔ اگر چہ اس بازار کے کار پردازوں نے بڑی بڑی جوان عورتوں کو بہلا پھسلا کر یہاں بٹھایا مگر لاہور کی ہیرا منڈی اول نمبر پر نہ آ سکی۔ یہ وقت تھا جب طوائفوں کو سرکاری خزانے سے رقوم بھجوائی جاتی تھیں اور اسی وجہ سے طوائفوں کے دماغ آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور وہ عام شخص سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ لیکن یہ صورتحال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت ختم ہونے کے بعد اس بازار کے مکینوں پر بھوک و ننگ غالب آ گئی اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے اپنے دروازے ہر شخص کے لیے کھول دیئے۔ سرکاری سرپرستی ختم ہونے اور نوکر شاہی کے آنکھیں پھیرنے سے ان کی ٹھاٹھ باٹھ قائم نہ رہی اور رہی سہی عزت ''دو کوڑی'' کی رہ گئی۔ مجبوراً ان ناچ گانے والیوں نے بھی اپنے کپڑے اتار دیئے اور اپنی عصمت کو بیچ بازار لا کھڑا کیا جس کا سبب صرف روٹی کا حصول

تھا۔ جب تاج وتخت چھن گیا تو حکمرانوں کی گود گرم کرنے والیاں بھی باہر آ کھڑی ہوئیں اور نوابوں کو ناز ونخرے دکھانے والیاں دھکے کھا کر اس بازار میں اپنے جسم کو گوشت کے بھاؤ بیچنے لگیں۔ آہستہ آہستہ گانا سننے والوں کی تعداد کم ہوئی اور جسموں کے سوداگر یہاں آنے لگے۔ یہ علاقہ جو کبھی مخصوص وقت کے لیے کھلتا تھا اب رات کی تاریکی پھیلنے کے ساتھ ہی دن کا سماں پیش کرنے لگا۔ عورتوں کی خرید وفروخت اور انہیں مخصوص وقت کے لیے اپنے ہمراہ لے جانے کا دھندہ عروج پر پہنچ گیا۔ ان حالات میں ان طوائفوں اور حسین پریوں پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے والے یہاں پر کنگال ہو کر ''دلالوں'' کا کام کرنے لگے۔ کچھ نے پھولوں کے ہار لگا لیے جو وہ آنے والوں کو بیچتے اور انہیں خریدنے والے ان کی بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ طوائفوں کے ''کوٹھوں'' پر قدم رکھا کرتے۔ آگے چل کر یہاں پان سگریٹ کے ''کھوکھوں'' کا وجود عمل میں آیا اور یہی لوگ یہاں پر نئے کڑک نوٹوں کی گڈیاں بیچنے لگے۔ دوسرے علاقوں سے عورتوں کو خرید کر لانا اور اس بازار میں بٹھا دینا بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ معاشرے کے ٹھیکیداروں کے بیانات اور مذہبی جماعتوں کی اہمیت کے باوجود اسکے جدید دور میں بھی یہ دھندا عروج پر رہا۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء دور میں اس علاقے کے بند کرنے کا شور بلند ہوا۔ ضیاء الحق مذہبی حلقوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے مگر انہوں نے اس بازار کو بند کرنے کی بجائے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اس کے اوقات میں تبدیلی کروادی۔ نئے صدارتی احکامات کے موجب رات کے 12 بجے کے بعد یہاں پر ناچ گانا نہیں ہوسکتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ طوائفوں نے یہاں سے کوچ کرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ ملتان، حیدرآباد، کراچی سے نقل مکانی کرنے والی طوائفیں گناہ کے اس بڑے بازار میں موجود تھیں مگر پھر یہ اوکاڑہ، پتوکی وغیرہ میں جا بسیں جو کہ لاہور سے نہ اتنا قریب تھا نہ دور۔

ہیرا منڈی میں اب بھی یہاں پر اچھی خاصی تعداد میں طوائفیں موجود ہیں۔ جو اگرچہ علامہ اقبال ٹاؤن، سمن آباد، ملتان روڈ، ماڈل ٹاؤن، گارڈن ٹاؤن، گلبرگ، فیصل ٹاؤن،

ڈیفنس وغیرہ کے پوش علاقوں میں رہائش پذیر ہیں مگر رات کو اپنے ''عشاق'' کی محافل میں شرکت کے لیے اپنے دفاتر (بازار حسن کی مخصوص زبان میں کوٹھے کو دفتر ہی کہا جاتا ہے) میں آ جاتی ہیں۔ بعض ''موڈی'' طوائفیں اب اس تنگ گلیوں میں آنے سے احتراز کرتی ہیں اور کئی کئی کنالوں پر مشتمل بجی سجائی اپنی کوٹھیوں اور بنگلوں کے ڈرائنگ روم میں یہ محفل سجا لیتی ہیں۔ ہیرا منڈی نہ تو بازار حسن ہے اور نہ ہی کوئی دلکش جگہ ہے بلکہ یہ تو انسانی اجناس کے نیلام گھر میں پامال روحوں اور زندہ جسموں کا قبرستان ہے۔ جہاں لاتعداد انسانی گدھ خون پینے اور ہڈیاں نوچنے میں مصروف ہیں۔ تاہم اب اس کا وہ مقام نہیں رہا جو کسی دور میں ہوا کرتا تھا۔ اس طرف آمد کا لوگ راستہ بھولتے جا رہے ہیں لیکن اس میں خوشی کا پہلو اس لیے نہیں ہے کہ اب طوائفوں کے گھروں پر جوان ہونے والی نئی نسل نے اس علاقے کو خیرباد کہنا شروع کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہاں رہنے سے ان کے مقام اور عزت پر حرف آ رہا ہے اور معاشرہ ان کو وہ مقام نہیں دیتا جس کے وہ حقدار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں سے نکل کر وہ کسی بارونق علاقوں کی کوٹھیاں خرید کر وہاں منتقل ہو رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کا موقف ہے کہ کاروبار، کاروبار ہوتا ہے، یہاں کیا جائے یا کسی اور جگہ خریدنے والا خود بخود آ جائے گا۔ اسی رجحان نے شہر کے ہر علاقے کو گندہ کر دیا ہے۔ یہی طوائفیں لاہور کے مختلف علاقوں میں شفٹ ہو کر وہاں کی معصوم اور شریف بچیوں کے سروں پر لٹکتی ہوئی ننگی تلوار بن گئی ہیں۔

لاہور میں سڑکوں کے کنارے فٹ پاتھوں پر کھڑی بعض غلط اور شہر کے مختلف علاقوں میں گھنٹوں مشکوک گھومتی عورتوں کی بڑھتی ہوئی اکثریت ہمیں یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ عورت وقت کے آگے سرنگوں ہو چکی ہے۔ اس نے بھوک کی آگ مٹانے اور اچھے کپڑے پہننے کے لیے اب سڑکوں، پارکوں اور ہوٹلوں میں گھوم پھر کر شکار تلاش کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس نے اپنے ساتھ ساتھ اپنی اولاد کو بھی اس قبیح دھندے میں شریک کر کے اسکو بھی روزی کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ یہ لفاظی یا کسی دانشور کا قول نہیں بلکہ

حقیقت ہے کہ عورت اگر عزم کر لے کہ اس نے برا کام نہیں کرنا تو اس کو دنیا کی کوئی طاقت ایسا کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ اگر وہ اپنے پاؤں کے گھنگھروؤں کی جھنکار سے بڑے بڑے نوابوں اور چھوٹی حیثیت کے لوگوں کو اپنا فرماں بردار بنا سکتی ہے اور ایسے لوگوں کو موم بتی کی طرح پگھلا کر اپنے پاؤں میں جھکا سکتی ہے جن کی گردنوں میں سریا ہوتا تھا تو پھر وہ خود شریفانہ زندگی کی طرف مائل کیوں نہیں ہو سکتی؟

بازار حسن کے قریب رہنے والے خواجہ احمد حسن عمر کے 70 ویں سال سے زائد ہوں گے۔ انہوں نے اگر چہ اس علاقے میں کبھی کسی برائی سے ''استفادہ'' نہیں کیا مگر وہ اس علاقے کی ہر شئے سے بخوبی آشنائی رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بازار حسن کا تصور آتے ہی ذہن میں بڑے دلکش جذبات ابھرتے ہیں مگر اس تنگ و تاریک گلیوں میں بوسیدہ مکانات کے اندر بیٹھی ہوئی میک اپ کے بل بوتے پر خوبصورت نظر آنے والی عورتیں جن کی آنکھوں میں نظر آنے والی رومانوی چمک اب افسردگی و حسرت میں ڈھل گئی ہے ان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اب بازار، بازار حسن نہیں بلکہ محض ایک بستر بن گیا ہے۔ کیونکہ عورت نے اپنے آپ اس قدر سستا بیچنے اور خریدنے والے مردوں سے ایسا انتقام لیا کہ انکے گھر اجاڑ دیئے اور اب انکی عورتوں کو وہ کھینچ کھینچ کر اس بازار کی زینت بنا رہی ہیں۔ پرانی طوائفوں اور جسم فروشی کا دھندہ کرنے والیوں کی زندگیوں میں حقیقی انقلاب اس وقت آیا جب فلمی صنعت کے نئے چہرے ڈھونڈنے والوں نے بازار حسن کا رخ کیا۔ انہیں اپنی طرف مائل کرنے میں ان نازک اندام کلیوں کو کچھ زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ فلمی صنعت میں اگر چہ انہیں اتنے پیسے نہیں ملتے مگر مقبولیت اور شہرت سے وہ اپنے جسم کی بھی اچھی خاصی قیمت وصول کرتی ہیں اور ان کے ساتھ رات گزارنے والے اس بات پر سر اٹھا کر چلنے لگتے ہیں کہ ایک بڑی اداکارہ نے ان کا پہلو گرم کیا۔ صحافیوں اور فوٹو گرافروں نے ان نئے چہروں کو اخبارات اور رسائل میں دھڑا دھڑ اچھاپنا شروع کر دیا ہے۔ اخبارات میں چھپنے والے انٹرویوز اور خبروں نے ان اداکاروں کو ایک بار

پھر آسمان پر لا بٹھایا ہے اور یوں لگتا ہے کہ پھر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور کو دوبارہ اہمیت حاصل ہو گئی۔

جسم فروشی اور بدکاری کا کاروبار ایک نسل سے دوسری نسل اور اس سے تیسری نسل کی طرف منتقل ہوا ہے۔ اسکے علاوہ انہی حسینوں نے اپنے کوٹھوں پر آنے والے تاجروں، صنعت کاروں، سرکاری افسروں اور سیاستدانوں کی محبت کا دم بھر کر فوائد اٹھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ 1970ء کی دہائی میں پاکستان کے بڑے بڑے سیاستدان بھی بڑی رغبت کے ساتھ اس بازار کے مہمان بننا شروع ہوئے۔ صدر یحییٰ خان اور بھٹو کے دور میں طوائفوں کی ایوان اقتدار میں رسائی ممکن ہوئی تو وہ کارروائی کرنے والی سرکاری ایجنسیوں کے اہلکاروں کو بھی اوقات یاد دلانے لگیں۔ طوائفوں کی اس بازار سے باہر سرگرمیاں بڑھیں تو انکی زندگیوں کو خطرے سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک سے زائد مردوں کی بانہوں میں جھولنے کا نتیجہ ان کی زندگی کی خاتمے کی صورت میں نکلا۔ نگو اس بازار میں قتل ہونے والی پہلی طوائف تھی جو ایک امیر کبیر شخص سے بے وفائی کی مرتکب ٹھہری تھی۔ اس کے بعد طوائفیں محتاط ہو گئیں اور انہوں نے تعلقات تو بیک [illegible] رکھے مگر انتہائی احتیاط سے کہ دوسرے کو خبر بھی نہ ہو۔ اسکے بعد اس بازار سے نسبتاً شریف لڑکیوں کی باہر شادیوں کا رجحان بڑھا۔ بعض نے زبردستی شادیاں کروائیں اور ہمیشہ کے لیے اس بازار کو خیر آباد کہہ دیا اور بعض کو اپنی ماؤں کے سخت رویے کی بنا پر جذبات کا گلا گھوٹنا پڑا۔ نادرہ، نیناں نامی لڑکیاں بھی بازار حسن سے تعلق رکھتی تھیں اور انہیں بھی رقابت میں ہی قبر کے اندر دفن کر دیا گیا۔ ایک طویل عرصے کی تاریخ رکھنے والا بازار حسن ان دنوں حسرت و یاس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ زندہ ہے۔

حکومتیں تو اس بازار کو ختم نہ کر سکیں مگر معاشرے اور وقت کے تھپیڑوں نے یہاں کے مکینوں کو اپنی لامحدود سرگرمیاں محدود کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب یہاں کی طوائفیں جو کبھی پچاس اور سو کی طلب گار ہوتی تھیں کئی کئی ماہ کے لیے خلیجی ریاستوں کے دوروں پر جاتی ہیں اور وہاں

ہوٹلوں میں ''پاکستانی مجرا'' کے نام سے پروگرام میں شرکت کر کے دینار اور درہم کی شکل میں نوٹ بٹورتی ہیں۔ کچھ گروپ یورپ، برطانیہ اور کینیڈا کے مختلف شہروں میں بھی اپنے پروگرام پیش کرنے جاتے ہیں۔

بازار حسن کی موجودہ صورتحال یہ ہے کہ ماں، خالہ، چچی اور دیگر پرانے خیالات کے بزرگ لوگ اپنا کاروبار اب بھی اس علاقے میں جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن ان کی نوجوان نسل اب باشعور ہو چکی ہے۔ ان کے اچھے دام کھرے کرنے کے لیے انہیں جو تعلیم دلائی گئی اس نے انکے اندر ضمیر کو بیدار کر دیا اور اب وہ جسم فروشی یا ڈانس کو اچھا نہیں سمجھتے۔ ان سے پوچھا تو وہ کہتے ہیں کہ ان کا اس بازار سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ شریف اور معزز گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ حالانکہ جب وہ مرتے ہیں تو ان کے جنازے اسی بازار سے اٹھائے جاتے ہیں۔ اس بازار کی وہ روایتی رونق اب مفقود ہو چکی ہے۔ بازار کے معاملات چلانے والا ''ماما مودا'' (میاں محمود) اب ایک نامعلوم بیماری کا شکار ہو کر بستر مرگ پر اپنے آخری وقت کا منتظر ہے اور اس کے بعد اس جیسی چودھراہٹ کرنے کی کسی میں ہمت نہیں۔ اب چند ایک کوٹھوں کے علاوہ بہت کم کوٹھے ایسے ہیں جہاں رات کو طبلے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہاں پر اب وہی طبقہ رہائش پذیر ہے جن کے پاس اپنی کوٹھیاں یا مکان خریدنے کی سکت نہیں یا جن کے ماں باپ ان کو یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دے رہے۔ درحقیقت بازار حسن انہی لوگوں سے آباد تھا۔ جو مکان طوائفوں نے خالی کر دیئے تھے وہاں پر اب ہیجڑے آباد ہو گئے ہیں جو یہاں ڈانس پارٹیوں کی شکل میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اب ہیجڑے اتنی بڑی تعداد میں یہاں آباد ہیں کہ بعض اوقات ہیرا منڈی ''ہیجڑا منڈی'' معلوم ہوتی ہے۔

حیرت تو یہ ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد 63 سال مکمل ہونے کو آئے اور ہم اسلامی جمہوریہ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی جسم فروشی کے اس دھندہ کو ختم کرنے کے لیے عملی اقدامات نہیں کر سکے۔ اس مشرقی معاشرے میں اس مذموم دھندے نے ہمارے معاشرے پر

بہت بُرے اثرات مرتب کئے ہیں۔اب یہ دھندہ ایک علاقے تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے اپنی جڑیں پورے لاہور بلکہ پورے پاکستان میں پھیلا لی ہیں۔بوڑھی طوائفیں جو کبھی اس بازار کا حسن ہوا کرتی تھیں اب اندھیری کوٹھڑیوں میں زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہی ہیں۔ انہوں نے اپنی دام الفت کا اسیر ہو جانے والے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ساتھ ساتھ عیاش بیوروکریٹس کے پہلو گرم کئے اور ان میں بعض کی اولادوں کو بھی جنم دیا۔ان میں لڑکیاں تو جوان ہو کر اس بازار کی زینت بن گئیں اور لڑکے کندھوں پر رومال رکھ کر ان کی ''دلالی'' کرنے لگے۔اس کے ساتھ ساتھ جسموں کے سوداگروں نے مختلف علاقوں سے معصوم لڑکیاں اغواء کیں اور انہیں یہاں لا بیچا۔یہی نہیں بلکہ گھر سے بھاگی ہوئی یا درگاہوں پر ماں باپ سے بچھڑی ہوئی بچیاں بھی ان ضمیر فروشوں کے ہاتھوں اس بازار کی دیواروں میں چن دی گئیں اور پھر تجربہ کار نائیکاؤں کے توسط سے ناچنے کے فن سے آشنا ہو گئیں۔

جسم فروشی کی وجوہ:

لاہور، فیصل آباد، ملتان، راولپنڈی اور ملک کے دیگر شہروں میں پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے بہت ہی کریہہ مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔شاہدرہ کی رہنے والی ایک عورت اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے درختوں کے تنوں کے اردگرد کیڑوں اور چیونٹیوں کے لیے ڈالی گئی دال چن رہی تھی تاکہ اسے پکا کر ہی بچوں کی بھوک مٹا سکے۔ظاہر ہے اگر اس سے بھی کچھ نہ ہوا تو مجبوراً یا تو وہ خودکشی کرتی یا پھر جسم فروشی پر مجبور ہوتی۔ ہمارے معاشرے میں کوئی بھی شخص کسی بیوہ یا غریب عورت کو نوکری دینے پر تیار نہیں ہوتا البتہ نوکری کے نام پر جو لڑکی اپنا جسم پیش کر سکے اس کو فوراً ملازمت مل جاتی ہے۔لاہور کے اکثر دفاتر میں یہی کچھ ہوتا ہے۔لڑکی پہلے تو مجبوری میں یہ کام کرتی ہے پھر اس کو روپیہ کمانے کا چسکا پڑ جاتا ہے اور وہ اس طرح جلد امیر ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ایسی بہت سی عورتوں نے ڈیفنس، گلبرگ، فیصل ٹاؤن، علامہ

اقبال ٹاؤن یا دیگر نواحی آبادیوں میں کوٹھیاں تعمیر کر رکھی ہیں جہاں عام آدمی کو جانے کی جرات بھی نہیں ہوسکتی۔ ان عورتوں سے بڑے بڑے سیاستدانوں، صنعت کاروں اور سرکاری ملازمین کے تعلقات ہوتے ہیں۔ یہ افراد دوسرے ملکوں یا شہروں سے آنے والے مہمانوں کے دل بہلانے کے لیے ان ہی عورتوں سے رابطے کرتے ہیں یا پھر ایسی عورتیں بھی سڑکوں پر کھڑی ہوجاتی ہیں لیکن یہ بہت ہی سستا پن ہوتا ہے جو ایک تجربہ کار کال گرل کو زیب نہیں دیتا۔

کال گرل اور طوائف میں فرق یہ ہوگیا ہے کہ کال گرل تو چند سو یا ہزار روپے کے بدلے جسم فروشی پر راضی ہوجاتی ہے لیکن پیشہ ور طوائف ایسا نہیں کرتی۔ ان طوائفوں کی بھی کئی قسمیں ہیں ایک تو ٹیکسیاں ہیں جو اپنے دلالوں یا خود جسم فروشی چند سو روپے کے عوض کرتی ہیں۔ باقی جو خاندانی طوائفیں ہیں وہ ایسا نہیں کرتیں بلکہ جسم فروشی کو برا سمجھتی ہیں۔ وہ سارا سارا دن گانے کی ریہرسل کرتی ہیں، رقص سیکھتی ہیں اور صرف اسی فن سے رزق کمانا چاہتی ہیں۔ وہ کسی ایک مرد کی رکھیل رہنا تو پسند کرلیں لیکن ہر ایک کا بستر گرم نہیں کرتیں۔ ان طوائفوں کی لاکھ منت سماجت کریں وہ کسی طور پر بھی جسم حوالے کرنے پر تیار نہیں ہوں گی۔ وہ صرف مختلف تقریبات میں گانے گاتی ہیں یا رقص کرتی ہیں جسے مجرے کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ مجھے یاد ہے لندن میں لاہور سے آئی ہوئی دو طوائفوں سے میری شناسائی ہوگئی۔ یہ دونوں گانے والیاں تھیں اور ایک کلب میں اپنی آواز سے ہی لوگوں کا دل بہلاتی تھیں۔ ایک شخص نے ایک گلوکارہ کو پانچ سو پونڈ (پچاس ہزار روپے) کے عوض جسم فروشی کے لیے مجبور کیا لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کردیا ''باؤ جی ہم نے اگر جسم کی کمائی ہی کھانی ہوتی تو پھر کئی سال لگا کر گانا سیکھنے کی ضرورت کیا تھی؟'' اس پر وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا تھا۔ البتہ اگر طوائف کی مرضی ہو تو پھر وہ چوری چھپے جسم پیش کردیتی ہے ورنہ ایک ہی آدمی کے لیے وقف رہنا زیادہ پسند کرتی ہے۔

لاہور کی ہیرا منڈی پر فیچر (ایک اور پہلو)

(یہ فیچر بھٹو دور کے بعد ضیائی مارشل لاء کے آغاز میں لکھا گیا تھا، مصنف)

ہمیشہ سے ہی شاہی محلوں اور معبد گاہوں کا چکلہ سے قریبی تعلق رہا ہے اور اس کے آثارو شواہد آج بھی قدم قدم پر دستیاب ہیں۔ پاکستان و ہندوستان میں قحبہ خانے مرکزی یا صوبائی دارالحکومتوں میں پائے جاتے ہیں اور یہ ہمیشہ شاہی محلوں سے ملحق دیکھے گئے ہیں۔ ہندوستان میں محمد تغلق پہلا مسلمان حکمران ہے جس نے اپنے نوتعمیر صدر مقام ''دولت آباد'' میں ''عصمت فروشی ایریا'' قائم کیا ہے۔

شہنشاہ جلال الدین اکبر ''شیطان پورہ'' کا بانی تھا جو فتح پور سیکری میں طوائفوں کی بستی تھی۔ اکبر نے دہلی میں چاوڑی بازار کھولا جو لال قلعہ اور چاندنی چوک سے ملحق تھا۔ لاہور میں ''ہیرا منڈی'' شاہی مسجد اور شاہی قلعہ کے سائے میں ''شاہی محلّہ'' کے نام سے موسوم ہے۔

ہیرا منڈی کی تاریخ دھندلکوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ نام نہاد مورخین نے بادشاہون کے تذکرے تو کیے ہیں لیکن یہ بتانے کی زحمت نہیں کی کہ ان بادشاہوں کے سایہ میں کیسے گھناؤنے سلسلے چلتے رہے۔ ''تحقیقاتِ چشتیہ'' اور ''ہسٹری آف لاہور'' میں ہیرا منڈی کے وجود پر بعض منتشر سے فقرے، کہیں کہیں تو ملتے ہیں مگر باقاعدہ عنوان کے تحت نہیں اور نہ ہی ان ''شرفاء'' نے اس موضوع پر تحقیق کی کوئی زحمت کی یا ضرورت سمجھی۔

بہرحال، جہاں تک بکھری ہوئی شہادتوں اور روایتوں کا تعلق ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ جلال الدین اکبر نے لاہور میں اس کاروبار کو باقاعدہ منڈی کی شکل دی جیسا کہ انہوں نے دہلی میں چاوڑی بازار اور فتح پور سیکری میں ''شیطان پورہ'' جیسی بستیوں کی بنیاد بھی رکھی۔ اس روایت کو اس امر سے تقویت حاصل ہوئی ہے کہ لاہور کے شاہی قلعہ کی از سر نو تعمیر بھی اکبر نے ہی کی تھی اور ظاہر ہے کہ جب اس نے شاہی قلعہ کو گرا کر نئے سرے سے بنوایا تو

اس کے اردگرد کے علاقے کو فراموش نہیں کیا ہوگا۔ یہ علاقہ اس لیے بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ شاہی قلعہ کی بیگمات، خادمائیں، کنیزیں اور دوسری خواتین اپنی ضروریات اسی گردونواح سے پورا کرتی تھیں۔ مثلاً موتی بازار ہے جہاں ''بیگم شاہی مسجد'' اس امر کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ شاہی قلعہ اور دربار کی خواتین نہ صرف یہاں عبادت کرنے آتی تھیں۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ ''شاپنگ'' کا دھندا بھی کر لیتی تھیں۔ یہ ''شاپنگ'' سبزیوں یا دوسری ضرورتوں کی نہیں بلکہ ہیروں، موتیوں اور زیورات کی ہوتی تھی۔ چنانچہ اس علاقہ کے دو حصے موتی بازار اور ہیرامنڈی، خود اپنے ناموں سے اپنی وجہ تسمیہ بیان کر دیتے ہیں۔ اس روایت کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ہیرامنڈی آج بھی پاکستان میں ''امی ٹیشن'' کے کاروبار کا بڑا مرکز ہے۔ ہاں مصنوعی پتھر بنتے ہیں۔ قیمتی پتھروں کی تراش خراش ہوتی ہے۔ اور انہیں پالش کیا جاتا ہے۔ جے پور، جودھپور اور راجستھان سے امی ٹیشن کے جتنے ماہر کاریگر ہجرت کر کے پاکستان آئے ہیں وہ سب ہیرامنڈی میں آباد ہوئے ہیں۔ ہیرامنڈی میں داخلے کا دروازہ ''ٹکسالی گیٹ'' ہے کسی زمانہ میں یہاں ٹکسال ہوتی اور سکے ڈھلتے تھے یہ سکے زیادہ تر سونے کی اشرفیاں اور چاندی کے روپے ہوتے تھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس طرز کا انتہائی قیمتی سرکاری کاروبار کسی ایسے علاقہ میں ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔ جو محض تماشبینوں کی آماجگاہ ہو۔ اور جہاں ہر قسم کے لوفر لفنگے آتے جاتے ہوں جیسا کہ آج کل ہے___ ان دنوں یہ علاقہ شہر کا سب سے محفوظ ترین اور مصروف ترین کاروباری و سرکاری مرکز تھا۔ اس کے ثبوت میں شاہی قلعہ، درباریوں کے محل، اونچی حویلیاں اور آخر میں ٹکسال کا وجود بھی ان شواہد کی فہرست میں شمار ہوتا ہے۔

مغل بادشاہوں کے درباروں سے نازنین پری چہرہ رقاصاؤں اور مغنیوں کی وابستگی، مغل حکمرانوں کے ساتھ خصوصیت سے نظر آتی ہے کہ وہ خوش ذوق و زندہ دل تھے۔ بہرحال اکبر نے اس کاروبار کو یہاں باقاعدہ شکل دی۔

جہاں شاہی مسجد سے اکبر کے زمانے میں وہاں ایرانی ترکی اور افغانستان کے تاجر آ کر اپنا ڈیرا لگایا کرتے تھے۔ وہ اس جگہ ہیروں کا کاروبار کرتے اور ہیروں کے بدلے میں ہندوستان کی بعض اشیاء لے کر واپس چلے جاتے۔ اکبر اعظم نے جب دین الٰہی ''ایجاد'' کیا تو ہندو اس کے بہت قریب آ گئے۔ ہندوؤں نے اکبر کو خوش کرنے کے لیے اسی جگہ داسیوں کو بسایا۔ یہی داسیاں بعد ازاں طوائفوں کا روپ دھار گئیں۔ اس وقت سے اب تک اس بازار میں راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں۔ ہیرا منڈی سے متعلق ایک اور روایت بھی ہے یہ کہ رنجیت سنگھ کے زوال کے بعد کچھ سکھ حکمرانوں نے لاہور کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا مصری شاہ سے راوی روڈ شاہدرہ کا علاقہ ہیرا سنگھ کے قبضہ میں آیا تو میکلوڈ روڈ سے گڑھی شاہو اور ددھرم پورہ تک گوجر سنگھ نے قبضہ کر لیا۔ اسی طرح اچھرہ اور ملتان روڈ کے علاقے کو لہنا سنگھ نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ بعض بوڑھوں کا کہنا ہے کہ ہیرا سنگھ کے نام سے ہی ہیرا منڈی منسوب ہوئی۔ کیونکہ اس نے طوائفوں کو کافی مراعات دے رکھی تھیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے علاقے کا نام ہیرا سنگھ کے نام سے رکھ لیا۔

سکھوں کے عہد میں عصمت فروشی کے کاروبار نے بے حد فروغ پایا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں سب سے زیادہ رسائی ایک طوائف مائی موراں کو حاصل تھی اس طوائف نے لاہور میں ایک مسجد ایک مندر اور گوردوارہ بھی تعمیر کرایا جو موراں سے منسوب ہوئی۔ موراں کی ایک بڑی حویلی جو پورا محلہ بن گئی ہے، اندرونِ شہر میں موجود ہے، موری دروازہ بھی اس موراں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سکھوں کے عہد میں نصف سے زائد لاہور طوائفوں کا مقبوضہ یا مملوکہ تھا۔ بعد میں انگریز آئے تو انہوں نے اس سلسلہ کو ہیرا منڈی کے مخصوص علاقہ تک محدود کر دیا۔

ہیرا منڈی کے اردگرد، بھاٹی، لوہاری اور ٹکسالی دروازوں کے باہر، باغات میں آج بھی کئی لوگ قیمتی پتھر لیے، فٹ پاتھوں پر بیٹھے بیچتے نظر آتے ہیں۔ یہ پتھر بہت قیمتی تو نہیں ہوتے

مگر بہر حال اس علاقے کے پرانے کاروبار کی نشان دہی ضرور کرتے ہیں۔

تقسیم سے پہلے برصغیر پاک و ہند میں 562 ریاستیں تھیں۔ ان تمام ریاستوں کے حکمرانوں کی رگوں میں طوائفوں کا لہو شامل ہے!

انہی نوابوں اور راجاؤں سے عصمت فروشی کو فروغ حاصل ہوا۔ غیر منقسم پنجاب کی ریاست چمبہ خوبصورت لڑکیوں کی ''پیداوار اور فروخت'' کے لیے ایک مشہور منڈی تھی، بعض راجہ و نواب، بیک وقت ماں اور بیٹی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

''یونسکو'' کی ایک رپورٹ کے مطابق لاہور کا عصمت فروشی کا مرکز برصغیر کا چوتھا بڑا مرکز ہے۔ یعنی کلکتہ، بنگلور، بمبئی اور لاہور۔ موجودہ صورت میں ہیرا منڈی و ٹبی کے قحبہ خانے کی تاریخ، پنجاب میں سکھوں کے زوال اور انگریزوں کے اقتدار سے شروع ہوتی ہے۔ تقریباً ایک صدی پیشتر یہ چکلہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اور اس میں نئی و پرانی انارکلی کا پورا علاقہ شامل تھا۔ طوائفوں کے مکانات، مغل درباریوں کے دفاتر اور رہائش گاہوں میں گھرے ہوئے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں نصف شہر طوائفوں کے قبضہ میں تھا!

قحبہ خانے کے موجودہ علاقہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ہیرا منڈی اور ٹبی۔ ان میں وہی فرق ہے جو اونچے طبقے اور نچلے طبقے میں ہے۔ یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ ایک جگہ آرٹ فروخت ہوتا ہے اور دوسری جگہ زندہ لاشیں! لیکن اب یہ بھی اجڑ چکا ہے۔

یہ پیشہ ور عورتیں ہیں۔ ان کی اپنی خاندانی روایات و اقدار، اپنے اصول اور معیار ہیں، ان لڑکیوں کو انسانوں سے میل جول اور تہذیب و تمدن کی بڑی بھرپور تربیت دی جاتی ہے۔ چنانچہ عام طور پر یہ لڑکیاں نہایت خوش اخلاق، لہجہ اور دھیما مزاج رکھتی ہیں یہ اپنے کنبوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ یہ عام جسم فروخت نہیں کرتیں بلکہ ان کے گاہک، مخصوص اور منتخب افراد ہوتے ہیں۔

کبھی یہاں طوائفیں، دہلیز پر لٹک کر، کھڑے ہو کر، مختلف پوز بنا کر گاہک کا انتظار کرتیں

یا اسے متوجہ کرتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا گویا وہ سولی پر ٹنگی ہوں۔ بالائی حصہ میں وہ کھڑکیوں میں بیٹھتی اور گاہکوں کو آنکھیں مارتی، مسکراتی یا فقرے کستی تھیں۔ یہ نکیائیاں کہلاتی ہیں جو سستے داموں جسم بیچتی تھیں۔

''رنجیت سنگھ نے جو خنجر ہمارے سینے میں گھونپا تھا۔ اسے ہم آزادی، حاصل کرنے کے سالہا سال بعد بھی نہیں نکال سکے۔ یہ خنجر شاہی مسجد کے پہلو میں بجتی پائل کی جھنکار طبلے کی تھاپ پر انگ انگ میں بجلیاں بھرے ناچتی گاتی طوائفیں اور جام وسبو کی محفلیں ہیں۔ آخر میں بند کمروں کے اندر انسان نما شیطانوں کا ننگا ناچ جس پر بظاہر پابندی ہے مگر جو سحر ہونے تک، جاری رہتا ہے پھر ایک طرف کھڑے بلند و بالا میناروں سے موذن کی اذان لوگوں کو نیکی کی طرف بلاتی ہے اور دوسری طرف تنگ و تاریک چوباروں سے نشے میں چور بھٹکی، روحیں اپنی گاڑیوں کا رخ گھروں کی طرف موڑتی ہیں۔ یہی نہیں شاہی محلے کے پہلو سے لگی شریفوں کی ایک بستی بھی ہے درمیان میں بس ایک دیوار ہی تو ہے اگر کبھی نیکی و بدی کے بیچ چھوٹی اینٹوں کی بنی ہوئی یہ دیوار ٹوٹ گئی تو کیا نیکی کا سیلاب بدی کو بہالے جائے گا یا بدی کا سیلاب؟

تو آئیے اب اس بازار کی چند ہستیوں سے آپ کو ملواؤں جن سے میں اس فیچر کے سلسلے میں ملا اور جنہوں نے کمال جرأت سے اپنا زخموں سے چور سینہ کھول کے میرے سامنے رکھ دیا۔ یہ مارشل لاء کے دور کی بات ہے۔ یہ رپورٹ اگر چہ پرانی ہے لیکن قابل غور ہے۔

نام فرضی ہیں اور واقعات حقیقی۔۔ نام میں کیا رکھا ہے کہ یہاں آ کر تو پوری شخصیت مسخ ہو جاتی ہے۔ سترہ سالہ ممتاز راولپنڈی کے ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے وہ ایک لڑکے کی ''محبت میں مبتلا ہوئی اور گھر سے بھاگ کھڑی ہوئی یہ لڑکا لائلپور (فیصل آباد) میں اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہرا۔ چندروز اس کے جسم اور جیب سے لطف اندوز ہوتا رہا اور جب رقم ختم ہو گئی تو اسے کوئی وجہ بتائے بغیر اپنے والدین کے پاس واپس چلا گیا لیکن ممتاز کی واپسی کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ وہ کچھ عرصہ تک اسی جگہ مختلف دوسرے لوگوں کی محبت یا ہوس کا نشانہ

بنتی رہی اس کی بے بسی وسادگی نے اسے ایک آسان شکار بنادیا تھا وہ نہیں جانتی تھی کہ اس جہنم سے بھاگ کر کہاں جائے؟ ایک گھر سے بھاگ کر یہ نوبت ہوئی تو آئندہ کیا حشر ہوگا؟

ان حالات میں ''منڈی'' کے ایک فرد نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا اور اسے لاہور لے آیا پھر اسے باقاعدہ بازار میں بٹھا دیا۔۔۔ ممتاز اس پیشہ سے خوش نہیں وہ اس سے نجات کی خواہاں ہے۔ لیکن والدین کے گھر واپسی ممکن نہیں کہ وہ اسے مار ڈالیں گے۔۔۔ چھ ماہ قبل وہ ایک گاہک کے ساتھ بھاگی وہ نوجوان تھا اور ایک دفتر میں کلرک، وہ شادی کا وعدہ کر کے اسے اپنے گھر لے گیا کچھ دن وہ اکٹھے رہے پھر ممتاز کو معلوم ہوا کہ ''کلرک بادشاہ'' تو پہلے سے شادی شدہ ہے۔ قبل ازیں اس کی بیوہ گھر گئی ہوئی تھی۔ اس کی واپسی پر زبردست ہنگامہ ہوا۔ گالیاں اور مار پیٹ۔۔۔ عصمت فروشی اس کے دامن کا سب سے غلیظ دھبہ تھی۔ چنانچہ سارا محلہ اس کے خلاف ہوگیا اور ممتاز کے لیے بازار میں واپسی کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہ رہا۔ واپسی پر وہ خوش نہیں لیکن اور کیا کرے؟ اسے شکایت ہے کہ اس بازار میں اصل کاروبار کنجروں اور مالکوں کا ہے۔ جو نوچیوں کو صرف کھانا کپڑا اور دوسری ضروریات دیتے ہیں۔ اس کے عوض نوچیاں اپنی تمام آمدنی ان کے حوالے کرنے پر مجبور ہیں۔

شمیم، ٹبی کی ایک آزاد پیشہ ورعورت ہے کرایہ کے کمرہ میں وہ اپنی ساس اور شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کی عمر 24 سال ہے اور جسم اچھا گداز، خدوخال تیکھے اور خوبصورت ہیں، ذات کشمیری ہے اور عصمت فروشی جدی پیشہ ہے۔

شادی ہونے تک شمیم یہ دھندا نہیں کرتی تھی مگر شادی کے بعد کھلی مارکیٹ میں آ گئی۔ اس کی ایک بہن بھارت کے شہر میرٹھ میں ہے۔ وہ قطعی ان پڑھ ہے مگر لہجہ میں سلیقہ ہے ایک دفعہ اس پیشہ سے اس کا جی اکتایا تو وہ باقاعدہ آنے والے ایک گاہک کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوئی اس نے شادی کا وعدہ کیا تھا مگر شمیم کو یہ جان کر بے حد تعجب ہوا کہ وہ بھی اس سے پیشہ ہی کرانا چاہتا تھا تب وہ واپس اسی جگہ آ گئی کہ اگر پیشہ ہی کرنا ہے تو کھلی مارکیٹ میں کیا برائی

ہے، اب وہ مرد کی باتوں یا اس کے وعدوں پر کبھی یقین نہیں کرتی۔ اس کے باوجود وہ اپنے ''گاہکوں کی محبوبہ'' ہے۔ ان میں سے بیشتر اس کے پاس باقاعدہ آتے ہیں۔ اور بعض اوقات جیب میں پیسے نہ ہوں تو بھی لطف اندوز ہو کر جاتے ہیں یہ ''ادھار'' ہوتا ہے جو شمیم نے اپنے منہ سے کبھی نہیں مانگا لیکن وہ ہمیشہ ادائیگی کر دیتے ہیں۔۔۔ عصمت فروشی جیسے پیشہ میں شمیم کا یہ رویہ خاصا عجیب وغریب ہے یہاں تو اجرت محنت سے پہلے طلب کی جاتی ہے دولت ہی سب کچھ ہوتی ہے اور اعتماد کوئی شے نہیں ہوتا۔ شمیم کا ایک اور رویہ، جو اس دھندے میں شاذونادر ہی نظر آتا ہے، یہ ہے کہ وہ اپنے پاس آنے والے ہر مرد کو قبول نہیں کرتی اور بعض اوقات کسی بھی ایسے شخص کو صاف انکار کر دیتی ہے جو اسے پسند نہ آیا ہو۔ اس عجیب رویہ کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ ''آزاد تجارت'' کرتی ہے اور اس پر ایسی شرائط عائد نہیں کہ وہ ایک مقررر قم ضرور کھائے گی اسے کسی کو اپنی آمدنی کا حساب نہیں دینا ہوتا۔ ورنہ کوئی ''نوچی'' یہ جرأت نہیں کر سکتی کہ وقت اور دولت ضائع کرے۔ اپنی ساس سے شمیم کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ لیکن اس کا اپنا کوئی بچہ نہیں اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے اس نے ایک لڑکے کو ''لے پالک بیٹا'' بنایا ہے۔

تسنیم، بہت خوبصورت، دیکھے نقوش، متناسب اعضا اور حسین وجمیل جسم کی مالک ہے۔ چہرہ سے وہ پیشہ ور لگتی ہی نہیں اس کے رخساروں پر ابھی تک شرم وحیا کی سرخیاں دوڑ جاتی ہیں۔ حالانکہ وہ کئی سال سے اس پیشہ میں ہے۔

ایک دفعہ اس نے یہاں سے باقاعدہ قانونی طور سے نجات کی کوشش کی، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو درخواست دی کہ اسے بازار سے اٹھایا جائے کیونکہ اسے یہاں جبراً رکھا گیا ہے۔ یہ درخواست وضابطہ کی کارروائی کے لیے علاقہ سے تھانہ میں پہنچ گئی جس پر پولیس کے ایک ٹاؤٹ نے اس سے شادی کرنے کی پیش کش کی اور پولیس کے زیر سایہ اس کی شادی ہو گئی۔ اور وہ یہ علاقہ چھوڑ گئی۔ لیکن یہ پیشہ مسلسل اس کا پیچھا کرتا رہا۔ اس ٹاؤٹ نے تسنیم کے حسن کو اپنی دولت کا آلہ بنالیا۔ وہ ''کال گرل'' ہو گئی عملاً زندگی میں کوئی بھی تبدیلی نہ آئی اور وہ مطمئن

نہ ہوسکی تو دوبارہ ''کھلی منڈی'' میں چلی آئی۔

تسنیم نے بتایا کہ بازار میں ضروری ہوتا ہے کہ کوئی محافظ مرد موجود ہو اس سے دو مقصد حاصل ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ دلالی بھی کر لیتا ہے اور دوسرے بوقتِ ضرورت حفاظت بھی کرتا ہے اس پیشہ میں مختلف قسم کے لوگوں سے مختلف النوع معاملات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر قسم کے لوگ آتے ہیں بعض کا رویہ جارحانہ اور اذیت پسندانہ ہوتا ہے۔ بعض نشہ باز ہوتے ہیں اور بعض تو ''باقاعدہ حملہ'' کرتے ہیں۔ ایسے تمام مراحل میں ''محافظ مرد'' عورت کی مدد کرتا ہے۔ یہ مرد بازار کے کنجر یا اپنے ہی رشتہ دار مثلاً بھائی، شوہر، باپ ہوتے ہیں۔ گویا گناہ کی زندگی میں بھی مرد کی حفاظت کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ گاہکوں سے اپنے رویہ اور ان کی محبت کے جواب میں تسنیم نے کہا ''یہ سب کچھ مشینی انداز میں ہوتا ہے، طوائف جذباتی طور پر مردہ ہوتی ہے۔ گاہک کے جذبہ و جوش سے اس میں کوئی تحریک نہیں ابھرتی۔ وہ کسی مرد کو دیر تک اپنے ''جذبے'' ظاہر کرتے رہنے کی اجازت نہیں دیتی۔۔۔ ''جلدی کرو، یہ تمہاری ماں کا جسم نہیں ہے کہ اس میں مہینوں ڈیرے ڈالو۔۔۔'' وہ اپنے سارے جسم سے کھیلنے کی اجازت بھی نہیں دیتی۔۔۔ طوائفیں، بے جذبہ اور بے روح انسانی مشینیں ہوتی ہیں۔ جو صرف گوشت فروخت کرتی ہیں۔

19 سالہ کاکو، صحت مند، خوبصورت جسم کی نوجوان لڑکی ہے۔ وہ کولہوں پر ہاتھ ٹکا کر اور آنکھ مار کر گاہک کو اشارہ کرتی ہے تو وہ کچے دھاگے میں بندھا چلا آتا ہے۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہے اور کوئی شرم و جھجک محسوس نہیں کرتی۔

گیارہ سال کی چھوٹی سی عمر میں وہ اپنے گھر سے نکلی، ضلع جھنگ کی یہ لڑکی ایک بڑھئی کی بیٹی ہے۔ چھوٹی عمر میں اس کی ماں مر گئی باپ نے ایک دوسری عورت سے شادی کر لی مگر یہ سوتیلی ماں، کاکو کے لیے عذاب ثابت ہوئی وہ ہمیشہ اسے مارتی پیٹتی یہاں تک کہ گھر کا ماحول اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا۔ ایک روز پہلے اسے ماں نے مارا۔ اور پھر باپ نے بھی

پٹائی کر دی۔ تب اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنی نانی کے پاس چلی گئی جو ملحقہ گاؤں میں رہتی تھی لیکن گاؤں کا راستہ اسے معلوم نہ تھا اور وہ کھو گئی، بھٹک گئی۔۔۔ اب تک کھوئی ہوئی ہے، بھٹکی ہوئی ہے۔۔۔ گاؤں کے باہر بیٹھ کر وہ رونے لگی تو ایک شخص نے آ کر اس سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور اپنے گھر لے آیا پھر وہ اسے لاہور لایا اور چند دن اس سے کھیلنے کے بعد اسے ہیرا منڈی کے حوالے کر کے چلا گیا۔ اس پیشہ میں اسے دو سال گزر رہے تھے کہ اس کے والدین کو خبر ہو گئی وہ اسے لینے آئے اور پولیس کے ذریعہ اسے برآمد کر لیا۔ لیکن چند ہفتے بعد وہ گھر سے پھر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور واپس اسی بازار میں آ گئی۔ وہ اپنے پیشہ سے قطعی مطمئن ہے اور فوراً کہتی ہے ''جی ہاں، میں طوائف ہوں'' ایسا معلوم ہوتا ہے گویا پوچھ رہی ہو ''آپ کیا ہیں؟''

45 سالہ کھانی سرینگر کے ایک پیشہ ور خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ 15 سال کی عمر میں وہ اس پیشہ میں آئی۔ گویا 30 سال سے ''دھندا'' کر رہی ہے اور ابھی ریٹائر نہیں ہوئی۔ البتہ اتنی ترقی ضرور کی ہے کہ اب اس نے اپنی پانچ نوچیاں رکھ لی ہیں۔ اچھی صحت، گول اور بھرا بھرا چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں جوانی میں بہت ''کماتی'' تھی سردیوں میں لاہور اور گرمیوں میں سرینگر اس کے مسکن ہوتے تھے، اس کی ایک بہن اب تک سرینگر میں ہے۔ اپنے پیشہ کے سلسلہ میں جواب دینے میں بڑی محتاط تھی۔

اسے گلہ تھا کہ اس کی نوچیاں خوبصورت نہیں، ان کی اچھی ''قیمت'' نہیں لگتی۔ جب کہ ان کے کھانے، لباس، رہائش اور دوسری ضروریاتی پر اچھی خاصی رقم اٹھ جاتی ہے۔ اس وقت دوپہر کے کھانے کا وقت تھا میں نے دیکھا کہ ان نوچیوں کو کوئی اچھی روٹی نہیں ملی صرف دال، چپاتی تھی۔ باورچی نے بتایا کہ یہی روزمرہ کی خوراک ہے۔ اس نے ان نوچیوں کی قیمت خرید نہیں بتائی اس بات چیت کے دوران ایک بوڑھا شخص کچھ فاصلہ پر کھڑا رہا یہ نوکر قسم کا غریب انسان معلوم ہوتا تھا لیکن استفسار پر معلوم ہوا کہ وہ اس کا شوہر ہے۔ جوانی کی عمر سے اور کبھی

کسی معاملہ میں دخل نہیں دیتا۔اس کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوا۔ ہر طوائف کسی نہ کسی فرمانبردار قسم کے مرد کو شوہر رکھ لیتی ہے۔بالکل اسی طرح جیسے مرد بیوی رکھتے ہیں۔

32 سالہ شبنم، امرتسر میں پیدا ہوئی اس کا باپ پیشہ ور کنجر تھا مگر ماں نہیں۔ بہر حال شبنم باپ کی رہنمائی میں پیشہ ور بنی۔ باپ نے اسے رقص وموسیقی کی تربیت دلائی۔اس نے اردو شاعری کی غزلیں گانے میں خاصا نام پیدا کیا۔اس کا گھر اردو شاعروں اور ادیبوں سے بھرا رہتا تھا۔اس کے بہت سے گاہکوں میں اردو کے شاعر بھی تھے ان کے بعض تحفے اب تک اس کے پاس موجود ہیں۔ جو محبت اور دوستی کی علامت کے طور پر اس نے سنبھال کر رکھے ہیں۔وہ اپنے گھر کے باہر بھی راتیں گزارنے یا گانے کے لیے جاتی رہی ہے۔اس دوران اس نے ایک کلاتھ مرچنٹ سے شادی کی اور پیشہ بند کر دیا۔اس شوہر سے اس کے ہاں چار بچے ہوئے اس کا شوہر پہلے بھی شادی شدہ اور چار بچوں کا باپ تھا۔ وہ اس بازار کا شوقین تھا اور وہاں کوئی دوسرے گھروں میں بھی جاتا رہتا تھا۔اس پر ان دونوں میں جھگڑا ہوا۔شبنم نے اس سے کہا کہ اگر اسے دوسری عورتوں کے پاس جانا ہے تو پھر وہ اپنے گاہک کیوں روکے۔ شبنم رقابت محسوس کرتی تھی وہ یہ پیشہ بھی چھوڑ دینا چاہتی تھی مگر اس شخص پر اعتماد نہ تھا اس لیے اس کے ساتھ اس کے گھر نہیں گئی اور پیشہ سے بدستور وابستہ رہی۔لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ پرانے گاہکوں سے بدستور وابستہ تھی اور انہیں بھگتا لیتی تھی۔البتہ وہ اپنی لڑکیوں کو اس پیشہ میں نہیں ڈالنا چاہتی۔

30 سالہ خوبصورت ودلکش الماس شاعری کی حد تک حسین ہے۔ بڑی مہذب اور سلیقہ شعار وہ طوائف کی نسبت فنکار زیادہ لگتی ہے۔اس کی ماں بھی اس پیشہ میں تھی اور ایک نواب کی داشتہ تھی۔س کے تین بچے ہوئے سب سے بڑی الماس تھی اور باقی دو لڑکے۔ الماس نے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی اور پھر موسیقی کا سبق لینے لگی اس نے خاصے اونچے لوگوں تک رسائی حاصل کی وہ عام طوائفوں سے گھلتی ملتی نہیں کہ وہ سستی اور گھٹیا ہیں اور اس ماحول سے نکلنے کی شدید خواہش رکھتی ہے۔اور خوشگوار ازدواجی زندگی کو انسان کی لازمی ضرورت سمجھتی

ہے۔لیکن اسے ایک بھی ایسا شخص نہیں ملا جس پر اعتماد کر کے وہ اپنا پیشہ ترک کر دے جو اسے محبت دے، حفاظت بخشے اور اس کے ماضی کو اس سے وابستہ نہ کرے۔ وہ اپنے ماضی کو بھول جانا کسی کی ہو جانا، کسی کو اپنا لینا چاہتی ہے۔ پیشہ کے ضمن میں اس کا سب سے پہلا مقصد اپنے خاندان کو بھوک اور فاقہ کشی سے بچانا تھا۔اس میں وہ کامیاب رہی۔اگر کوئی اچھا آدمی مل گیا تو میں اس سے شادی کرلوں گی اور اس دھندے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دوں گی۔

الماس کا کہنا ہے کہ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس پیشہ میں ایسے ایسے نشیب وفراز معاملات آتے ہیں تو وہ کبھی اسے اختیار نہ کرتی، موسیقی اب اس کی زندگی کا ایک حصہ بن گئی ہے۔

سروقد وخوبصورت اختر نے نویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔اس کی آواز بہت اچھی ہے جس سے خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔ریڈیو پر بھی جاتی ہے۔اس سے اس کی سرگرمیوں کا میدان اور زیادہ وسعت اختیار کر گیا ہے۔اس سے سکول وکالج کی ان طالبات سے ملنے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔جو پروگراموں میں شرکت کے لیے وہاں آتی ہیں۔اس سے یہ ہوا ہے کہ اپنے پیشہ کے گھٹیا پن کا جو احساس اسے تھا وہ اب زائل ہو گیا ہے۔اور وہ اپنے خاندان کے لیے ایک اچھا ذریعہ معاش ہے۔اس کے پیشہ کی ابتدا ایک دلچسپ داستان ہے۔ایک رات وہ اپنی ماں کے ساتھ سوئی تھی رات کو اس کی آنکھ کھلی تو ماں موجود نہیں تھی۔اس نے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا تو ایک بدنما شخص شراب کے نشہ میں مدہوش اس کی طرف بڑھا اسے دیکھ کر خوف زدہ ہوئی اور چیخ پڑی۔پھر اس نے دیکھا کہ اس کی ماں اور چچی اس شخص کے لیے ناچ اور گا رہی تھی۔اُس رات وہ اس شخص کو بھا گئی اور اس نے ایک رات کے لیے خاصی بڑی رقم میں اس کا سودا کیا۔یہ مرحلہ طوائفوں کے خاندانوں میں بڑا یادگار لمحہ ہوتا ہے اور اسے ''نتھ کھلوائی'' کہا جاتا ہے اس سے پہلے جب تک کنوار پن برقرار ہوتا ہے لڑکی نتھ پہنے رکھتی ہے۔ البتہ آج کل یہ کہا جاتا ہے کہ بعض طوائفیں کئی کئی بار نتھ کھلوانے لگی ہیں۔

کال گرلز کے بارے میں ایک رپورٹ:

ایک خفیہ ادارے کی رپورٹ کے مطابق طوائفوں کی نسبت لاہور میں کال گرلز کا زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اس کی بڑی وجہ مہنگائی، غربت، بیروزگاری، بھوک اور ضروریات زندگی کا پورا نہ ہونا ہے۔ آج کل بعض کال گرلز پولیس کے تعاون سے بھی کاروبار کرتی ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے جو کہ ایک مقامی اخبار کا فوٹو گرافر ہے اپنے ویڈیو کیمرہ سے پولیس کے تعاون سے جسم فروشی کرنے والی عورتوں کی فلم بنائی۔ اس نے یہ فلم اپنی کار میں بیٹھ کر کئی ماہ کی مشقت کے بعد تیار کی۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ کیسے پولیس کے سکواڈ خوبصورت اور جوان لڑکیوں کو گلبرگ کے حسین چوک، شادمان چوک، نہر کنارے، وحدت روڈ اور گارڈن ٹاؤن کے مڑیاں چوک میں رات کو کھڑا کر جاتے ہیں اور جب کوئی جوان ان سے گفتگو کے بعد انہیں اپنی گاڑی یا رکشے میں سوار کرتا ہے تو آگے کھڑے ہوئے سپاہی اس فرد کو دبوچ لیتے ہیں۔ اور اس کو بلیک میل کر کے اس سے رقم ڈھیلی کروا کر اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ ان عورتوں کو سگریٹ بھر کر چرس پیتے بھی دکھایا گیا تھا اور پھر پولیس اور ان کے درمیان بٹوری ہوئی رقم سے حصہ تقسیم ہوتے ہوئے بھی عکس بند کیا گیا تھا۔

مختلف علاقوں میں کال گرلز جنہیں عرف عام میں ٹیکسیاں کہا جاتا ہے کا شرح معاوضہ مختلف ہے۔ چھوٹے محلوں یا کٹڑیوں کی لڑکیاں تو دوسو روپے سے 5 سو روپے تک میں ہی اپنا جسم پیش کر دیتی ہیں لیکن علامہ اقبال ٹاؤن کی لڑکیاں ہزار تک جاتی ہیں۔ جبکہ ڈیفنس کی ایک ایک لڑکی دس دس ہزار روپیہ رات کا لے لیتی ہے۔ ڈیفنس ہی کے علاقے میں بعض نائیکائیں ایسی ہیں جو وہاں کے غریب گھرانوں کی لڑکیوں پر نظر رکھتی ہیں اور ان کے نتھ کھلوائی سے دو دو لاکھ روپے کی لیتی ہیں اور لڑکی کے ماں باپ کو انتہائی کم معاوضہ دیتی ہیں۔ اس مہنگائی نے انہیں آج اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ ان ہی دیہات کی لڑکیاں تیس تیس روپے میں بھی اپنا جسم

دوسروں کے حوالے کردیتی ہیں تاکہ ان کے گھر کا چولہا چل سکے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ ایک حساس ادارنے نے اس سلسلہ میں ایک رپورٹ تیار کی تھی جس کے مطابق 2003ء میں جسم فروشی کے 5 ہزار اڈے لاہور شہر کے مختلف علاقوں میں موجود تھے۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ نواب آف کالا باغ، امیر محمد خان جب فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں گورنر مغربی پاکستان تھے تو انہوں نے ہیرا منڈی میں جسم فروشی پر پابندی عائد کردی تھی۔ ان دنوں میں فیصل آباد (لائل پور) کے ایک اخبار میں رپورٹر تھا۔ میں نے امیر محمد خان سے کہا کہ آپ نے اس آرڈی نینس کے ذریعے چکلے تو بند کردیے ہیں لیکن انہیں متبادل روزگار فراہم نہیں کیا لہٰذا اب یہ گلیوں اور محلوں میں پھیل کر سارے معاشرے کو گندہ کردیں گی۔ چونکہ گورنر نے صرف اپنے حکم پر عمل درآمد کیا تھا اور ان کے لیے متبادل روزگار کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا چنانچہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ جسم فروشی عام بستیوں میں بھی ہونے لگی تھی۔ ان طوائفوں نے محلوں کی معصوم لڑکیوں کو ورغلا کر اس پیشہ کو اختیار کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کے بعد جنرل ضیاء الحق کا دور آیا تو اس نے بازار حسن خاص کر ہیرا منڈی اور دیگر چکلوں کے لیے مختلف پالیسی اختیار کی۔ وہ اس طرح کہ ناچ گانے کا بھی ایک مخصوص وقت متعین کردیا گیا جس کی وجہ سے ہیرا منڈی میں اپنے دھندے کو جاری رکھنا ان طوائفوں کے لیے مشکل ہوگیا۔ پھر عیاش لوگوں نے بھی یہاں آنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی تو یہ طوائفیں ڈیفنس، گلبرگ، فیصل ٹاؤن اور علامہ اقبال ٹاؤن میں منتقل ہوگئیں۔ پھر یہ بھی ہوا کہ صبح کے وقت پر ان محلوں میں اور رات کو گیارہ بجے سے دو بجے تک مجرے کے لیے اس بازار میں چلی جاتیں۔ ایسا اب تک ہورہا ہے۔ مجھے اب بھی ایک طوائف کا وہ واقعہ یاد آرہا ہے جس سے میری ملاقات 1994ء میں علاقہ اقبال کے نظام بلاک میں ہوئی تھی۔ اس طوائف کا نام نصرت تھا اس کا ایک فلیٹ روشنائی دروازے کے باہر واقع پارک کے بالمقابل تھا۔ وہ دن بھر اپنی بیٹی شازمہ کے ساتھ نظام بلاک میں رہتی تھی اور رات کو اپنی گاڑی میں ہیرا

منڈی آ جاتی تھی۔

ایک روز نصرت مجھے کہنے لگی۔" عکاسی صاحب سانوں کوئی پارٹ ٹائم ڈرائیور ای لبھ دیو" (ہمیں کوئی پارٹ ٹائم ڈرائیور ہی لا دو) میں ان دنوں واسا (ایل ڈی اے) میں ملازم تھا۔ نصرت نامی طوائف سے ملاقات اس وقت کے ایک کیمرہ مین نفیس احمد کے ذریعے ہوئی تھی۔ نفیس آجکل تو ایک بہت بڑی پروڈکشن ہاؤس کا مالک ہے اور ایک اچھا ہدایت کار بھی ہے۔ ان دنوں میں اور وہ پی ٹی وی کے لیے ایک فلمی پروگرام سلور سکرین تیار کرتے تھے۔ اس پروگرام کی تیاری کے دوران ہی نفیس احمد نے ایک لڑکی سے تعارف کرایا اور کہا کہ اس کا نام شازمہ ہے اور اس کی ماں اسے ایکٹرس بنانا چاہتی ہے۔ شازمہ خوبصورت دوشیزہ تھی جس کی عمر کوئی سولہ یا سترہ سال تھی۔ اس کی بلوری آنکھیں تھیں اور دیکھنے والا اسے دیکھ کر ایک بار تو اپنے ہوش کھو بیٹھتا تھا۔ ظاہر ہے اس کا مجرا دیکھنے بھی کافی لوگ کھنچے چلے آتے ہوں گے۔ مجھے اس بات کا پتہ نہیں تھا کہ ان کا تعلق ہیرا منڈی سے بھی ہے اور وہ رات کو مجرے کے لیے وہاں جاتی ہیں۔

مجرے کا لفظ اب تو سوسائٹی میں بالکل متروک ہو چکا ہے۔ یہ لفظ 1962ء تک تو رائج تھا لیکن 1963ء میں مجرے کا نام بدل کر ٹائم لگانا رکھ دیا گیا تھا۔ اور اسی کا تذکرہ یوں کیا جاتا تھا کہ فلاں طوائف فلاں جگہ پر ٹائم لگاتی ہے۔ 1980ء کے بعد ٹائم لگانے کا نام 'آفس لگانا' ہو گیا تھا۔ مجھے یاد ہے فوٹو گرافر اشرف ناگی نے پروین بوبی سے پوچھا تھا آجکل تم کہاں آفس لگاتی ہو تو اس نے کہا تھا نوگزے کی قبر کے پاس تحصیل بازار میں۔ دراصل وقت کے ساتھ ساتھ طوائفوں میں بھی تبدیلی آتی گئی ہے اور پھر طوائفوں نے باقاعدہ اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرنا شروع کر دی ہے تاکہ فلموں اور ٹی وی میں انہیں کام مل سکے۔ ایسی پڑھی لکھی طوائفوں نے بیرون ملک اسی بنا پر اچھے گھرانوں میں شادیاں بھی کی ہیں اور نبھائی بھی ہیں۔

شاہدہ منی سیٹھ عابد کے ایک عزیز کی بیوی ہے تو فلم سٹار ہیروئن سونیا شادی کر کے

ناروے میں آباد ہے۔ اسی طرح خطرناک جیسی جنسی فلم میں عریاں رقص کرنے والی طوائف انتیا ہدایت کار مسعود بٹ کی بیوی ہے۔ کئی ایک ہدایت کار اور فلمسازوں کی بیویاں طوائفیں رہی ہیں جبکہ سندھ کے کئی سیاستدانوں کی بیویاں بھی طوائفیں ہیں جنہوں نے نبھایا ہے۔ صرف گلوکارہ تصور خانم اپنے شوہر کی موت کے بعد واپس شوبز کی دنیا میں آ گئی ورنہ نجمہ اب تک مصطفےٰ جونیجو کی ہی بیوی ہے۔

ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا نوجوان، پرکشش اور خوبصورت ترین دوشیزہ شازمہ کا۔ شازمہ کی ماں کے کہنے پر میں نے واسا کے ایک شریف ترین ڈرائیور سے بات کی کیونکہ وہ پارٹ ٹائم نوکری کا ضرورت مند تھا۔ اس نے پارٹ ٹائم کام کرنے کی حامی بھری۔ اب شبیر شام کو ان کے گھر کام پر جاتا تو یہ ماں، بیٹی رات بھر اسے بازاروں اور مختلف جگہوں پر لیئے پھرتیں۔ پھر رات گیارہ بجے ہیرا منڈی لے جاتیں جہاں شبیر کو نوگزے کی قبر کے پاس چھوڑ کر خود تحصیل بازار میں آفس لگا لیتی۔ دو بجے آفس ختم ہوتا تو کار میں بیٹھ کر گھر واپس آ جاتیں۔ شبیر کو اب تک یہ بالکل نہیں پتہ تھا کہ یہ طوائفیں ہیں اور وہ ہیرا منڈی میں جاتا ہے کیونکہ وہ کسی دور دراز علاقے کا رہنے والا تھا اور لاہور صرف ملازمت کے چکر میں آیا تھا۔ ایک روز شبیر کار میں نوگزے کی قبر کے پاس بیٹھا تھا کہ دو نوجوان نشے کی حالت میں آئے اور اس کے قریب آ کر ایک دوسرے سے کہا کہ یہ ڈرائیور اس کا دلال ہوگا اسے ان کے رات کے ریٹ کا پتہ ہوگا۔ یہ لفظ سن کر شبیر گرم ہو گیا اور ان سے تو تو میں میں ہو گئی۔ دوسرے روز مجھے شبیر روہانسو حالت میں ملا اور کہا کہ میں آج سے پارٹ ٹائم نہیں کروں گا۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ جی یہ تو طوائفیں ہیں روز ہیرا منڈی جاتی ہیں اور رات کو یہ واقعہ پیش آیا۔

بہر طور اس کے بعد شبیر ان کے ہاں نہیں گیا۔ ایک روز نصرت نے مجھے کہا کہ میں اپنے بیٹے کو کیڈٹ سکول میں داخل کرانا چاہتی ہوں آپ میرے ساتھ چلئے۔ میں اس کے ساتھ نشتر ٹاؤن کے قریب کیڈٹ سکول میں گیا اور اس بچے کو چھٹی جماعت میں داخل کر دیا۔ نصرت کے

پاس دولڑ کے ہوتے تھے میں دونوں کو اس کے حقیقی بیٹے سمجھتا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ جس مکان میں وہ رہتی ہے وہ کسی تماش بین نے اسے لے کر دیا ہوا ہے۔ وہ کاروباری سلسلہ میں لندن گیا ہوا ہے اور جاتے ہوئے اپنے بیٹے کو اس کے ہاں چھوڑ گیا ہے۔ شاید وہ اس کے ماہانہ اخراجات دیتا تھا۔ ایک آدھ ماہ بعد وہ واپس آیا تو نصرت کو پتہ چلا کہ اسے اچھا خاصا منافع ہوا ہے تو اس نے اس سے مزید روپوں کا مطالبہ کیا لیکن اس نے مزید پیسے نہ دیئے جس پر دونوں میں جھگڑا ہو گیا اور وہ شخص اپنے بیٹے کو لے گیا جبکہ نصرت اور شازمہ نظام بلاک والا گھر فروخت کر کے واپس ہیرامنڈی کے ایک فلیٹ میں آ گئیں۔

شازمہ سے ہم نے ایک آدھ پروگرام میں کام کرایا تو اس کی خوبصورتی دیکھ کر Waves والوں کے منہ میں پانی بھر آیا اور انہوں نے فوٹو گرافر ہمایوں کی وساطت سے اس کی پبلسٹی کے لیے سائن کر لیا۔ شازمہ کی پبلسٹی فلم ٹی وی پر چلنے لگی۔ ''ویوز جادوگر'' اور یوں شازمہ اچھی خاصی شہرت حاصل کر گئی۔ اس کی شہرت اور خوبصورتی دیکھ کر فلموں کا ہدایت کار جاوید رضا مجھے کہنے لگا کہ میں اسے سائن کرنا چاہتا ہوں میرے ساتھ اس کے گھر چلو۔

ہم دونوں ہیرامنڈی آ گئے۔ جاوید رضا نے گانا سنا اور رقص دیکھا تو ایک ہزار روپیہ دے دیا بعدازاں اس نے فلم میں کام بھی دیا۔

شازمہ کی ماں اب مجھے ہیرامنڈی والے گھر بلانے لگی تھی وہاں لندن والے تماش بین کے فون آئے کہ صلح کر لو۔ نصرت ایک لالچی خاتون تھی وہ شاپنگ اور مزید رقم کا مطالبہ کر دیتی لیکن اس تماش بین کے پاس چونکہ پیسے ختم ہو چکے تھے اور شاید اس کا کاروبار بھی نہیں رہا تھا لہٰذا وہ منت سماجت کے ذریعے ہی کام نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے نصرت سے استفسار کیا تو اس نے غصے میں کہا الو کا پٹھا اب میرا دلال بننا چاہتا ہے لیکن میں نے اسے سختی سے منع کر دیا ہے کہ اب وہ فون نہ کرے۔ میں نے کہا نصرت یہ تو ظلم ہے آخر کئی سال سے تم اس کی رکھیل ہو۔ وے باؤ ہم اس وقت تک ہی رکھیل رہتی ہیں جب تک دولت ہو اس کے بعد لات مار دیتی ہیں۔ ہم

آخر بیاہتا بیویاں تو نہیں ہوتیں۔ یہ تماش بین بھی جب جی چاہے ہمیں چھوڑ دیتے ہیں اور کسی دوسری طوائف سے لو لگا لیتے ہیں۔

شازمہ کی تصویر اخبار جہاں کے سرورق پر چھپی تو اس کے نرخوں میں بھی اضافہ ہو گیا اور اس کے پیچھے بڑے بڑے سیٹھ لگ گئے۔ میرے ایک فلمساز دوست سہیل بٹ نے مجھے کہا کہ میں اسے فلم میں کاسٹ کرنا چاہتا ہوں میرا تعارف کرادو۔ میں نے اس کا ایڈریس بتا کر کہا کہ تم پیشہ ور فلمساز ہو اور وہ پیشہ ور طوائف خود ہی بات کر لو مجھے درمیان میں مت لے کر آؤ چنانچہ دونوں کی بات چیت ہو گئی اور سہیل بٹ نے اپنے فلیٹ پر آنے کی دعوت دے ڈالی۔

ان دنوں شبیر کے بجائے میرے ایک دوست اور اسٹنٹ جاوید پیا (اندھیرے اجالے سیریل کا میاں خان ASI) کا بھتیجا اس کا ڈرائیور تھا۔ اسے لے کر وہ گارڈن ٹاؤن برکت مارکیٹ چلی گئی جہاں خود تو باہر بیٹھ گئی اور شازمہ کو کمرے کے اندر بھیج دیا۔ شازمہ نے اس کمرے میں رقص کیا۔ اس کے بعد جب سب نے شراب پی لی تو عریاں رقص تک نوبت آئی اور پھر بہت کچھ ہوا۔ رات دو بجے شازمہ باہر آئی تو اس نے آ کر نوٹوں کی ایک گٹھی ماں کے ہاتھ میں تھما دی یہ کوئی سات ہزار روپے تھے۔ دراصل ان دنوں جس کی تصویر بھی اخبار جہاں کے ٹائٹل پر چھپتی تھی اسی کال گرلز کے رات کا نرخ سات ہزار روپے ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ٹائٹل چھاپنے والے فلم ایڈیٹر یونس بٹ کو نہ صرف لڑکیاں جسم پیش کرتی تھیں بلکہ نقد رقم سے بھی نوازتی تھی بعد میں میرا ایک شاگرد خالد ابراہیم بھی اس کے ساتھ نتھی ہو گیا تھا۔

سہیل بٹ سے ملنے کے بعد اور جاوید رضا کی فلم میں کام کرنے کے بعد فلم انڈسٹری کے کئی فلمساز اس خوبصورت دلکش اور پرکشش آنکھوں والی طوائف کے دیوانے ہو گئے تھے۔ ایک فلمساز نے ایک فلم ''مسلمان'' بنانے کا اعلان کیا جو شاید کشمیر کے موضوع پر تھی۔ اس نے اخبارات میں شازمہ کو ہیروئن لینے کا اعلان کیا اور بھرپور پبلسٹی کی۔ پھر اس نے ایک اور ڈرامہ

کیا۔اس نے فلم کی سپورٹ کے لیے مشہور سیاستدان نوابزادہ نصراللہ کا نام دیااور انہیں سٹوڈیوز بلا بھی لیا۔فلم کی افتتاحی تقریب بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔شازمہ کی تصویریں اخبارات میں نوابزادہ صاحب کے ساتھ شائع ہوئیں تو شازمہ کے والد کے کان کھڑے ہو گئے۔شازمہ کا والد ملتان کاایک بہت بڑا جاگیردار تھا۔اس نے اپنی بیٹی کونصرت کے چنگل سے بچانے کا عزم کیا۔اُدھرنصرت تقریباًروز ہی اپنی بیٹی کو مجرا کرانے کے لیے لے جاتی۔اس کے علاوہ رات کو ہیرامنڈی میں شازمہ اپنا آفس بھی باقاعدگی سے لگاتی تھی۔

ایک شام میں،نصرت اور شازمہ گاڑی میں کہیں جارہے تھے کہ گاڑی داتا دربار سے گزری تو نصرت بولی زاہد صاحب آج صبح ہم نے تیں دیگیں داتا صاحب پرآکر غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کی ہیں۔میں نے پوچھا کیوں شازمہ بولی داتا صاحب نے بھی تو ہماری باں پکڑی ہوئی ہے(ہمارا بازو تھاما ہوا ہے) میرے استفسار پراس نے بتایا کہ داتا صاحب کی مہربانی سے رات تیں ہزارروپے کا مجرا لگا ہے۔

ہاں تو اخبارت اور مختلف فلمی جرائد میں شازمہ کی تصاویر اور خبریں شائع ہوئیں تو جاگیردار نے ایک سازش تیار کی کہ کسی طرح بیٹی کو ہیرامنڈی سے نجات دلائے۔ایک روز وہ نصرت کے گھر آیااوراسے پیار جتانے لگا۔طوائفیں چونکہ لالچی ہوتی ہیں اور ہر قیمت پرآنے والے کوذبح کرنا چاہتی ہیں لہٰذا وہ نصرت کولبرٹی شاپنگ کے لیے لے گیا۔اس نے شاپنگ کے دوران شازمہ سے اکیلے میں ملنے کا وقت نکال لیا۔اس وقت جب نصرت مختلف قسم کے کپڑے پسند کرنے میں سٹور کے اندر گھوم رہی تھی والد نے سمجھایا کہ شازمہ تمہیں ذلیل وخوار ہونے کی ضرورت نہیں ہم خود جاگیردار ہیں دولت سے کھیلو گی اور میں تمہاری شادی اپنے بھتیجے سے کروادوں گا۔شازمہ کچھ کچھ راضی ہوگئی۔اس نے یہ بھی سمجھایا کہ تمہاری ماں تمہیں روزانہ کوئی نہ کوئی بستر گرم کرنے کے لیے کہے گی۔چنانچہ سازش تیار کرنے کے بعد جاگیردار خان صاحب واپس چلے گئے۔کوئی ایک ماہ بعد وہ دوبارہ واپس آئے دونوں ماں بیٹیوں کو ساتھ لے

گئے دونوں کو ایک بڑھیا ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھلایا اور پھر باہر سیر کے لیے نکل آئے۔ باہر آ کر اسے کچھ یاد آیا اور نصرت سے کہا کہ فلاں جیولری کی دکان پر میں نے نکلس دیکھا ہے چلو وہ لے آئیں۔ شازمہ سے کہا کہ بیٹی تم چل کر پجارو میں بیٹھو۔ شازمہ پجارو میں ڈرائیور کے پیچھے بیٹھ گئی۔ خان صاحب نصرت کو لے کر جیولری کی شاپ میں گئے۔ ایک دو جیولری شاپس پر پھرنے کے بعد انہوں نے ایک خوبصورت ہار نصرت کو لے کر دیا۔ پھر اس نے کہا کہ اس کی خواہش اگر ڈریسز خریدنے کی ہے تو وہ بھی لے لے کیونکہ میں شاید پھر ایک ماہ کے بعد واپس آؤں۔ نصرت چونکہ ایک لالچی عورت تھی اس نے سوچا اس کو زیادہ سے زیادہ ذبح کرنا چاہیے کیونکہ دو ماہ قبل ایک اور تماش بین ابوظہبی سے آیا تھا تو نصرت نے اس سے نہ صرف رقم سمیٹی تھی بلکہ اچھی خاصی شاپنگ بھی کر لی تھی۔ اس نے نہ جانے کونسی دوا کھا کر نصرت سے سیکس کی کہ اس کی کمر دو ہفتے تک دکھتی رہی تھی اور اسے باقاعدہ ڈاکٹر سے علاج کرانا پڑا تھا۔ اس دوران لندن جانے والے جس شخص کی وہ داشتہ تھی وہ اب ہیرا منڈی والے فلیٹ میں نصرت کو فون کرتا اور بتاتا کہ اسے وہ بہت یاد آتی ہے اور اس کے بغیر وہ رہ نہیں سکتا۔ لیکن نصرت کو پتہ چل چکا تھا کہ اب وہ سیٹھ نہیں رہا کیونکہ اسے رنگوں کے کاروبار میں نقصان ہوا تھا۔ میں نے نصرت سے پوچھا کس کا فون ہے کہنے لگی اسی دلے کا ہے ولایت سے آ گیا ہے اس دفعہ اسے نقصان ہوا ہے اور چاہتا ہے کہ میرا دلال بن جائے لیکن میں نے اسے کہا ہے کہ آئندہ مت فون کرنا۔

ہاں تو نصرت لبرٹی میں شاپنگ کرتی رہی کوئی ایک گھنٹے بعد جب وہ خان صاحب کے ساتھ پارکنگ سٹینڈ پر آئی تو وہاں سے پجارو غائب تھی کیونکہ خان صاحب نے ڈرائیور کو پہلے سے سمجھا رکھا تھا کہ جوں ہی میں دکان میں داخل ہوؤں تم لڑکی کو لے کر سیدھے ملتان روانہ ہو جانا۔ اب اس وقت تک پجارو اوکاڑہ پہنچ چکی ہوگی۔ بہر طور خان صاحب نے پجارو کے نظر نہ آنے پر پریشانی کا اظہار کیا اور کہا کمبخت یہی کہیں ہوگا۔ شاید شازمہ نے کوئی چیز خریدنی ہو تو

دوسرے طرف لے گئی ہو لیکن میں نے تو تاکید کی تھی کہ یہیں رہے۔ بہر طور کافی دیر ڈھونڈ نے کے بعد خان صاحب نے ٹیکسی لی اور ڈرائیور کو برا بھلا کہتے ہوئے نصرت کے گھر آ گئے۔ اسے وعدہ کیا کہ آخر وہ آئے گا تو میرے پاس ہی میں اطلاع کر دوں گا یا شازمہ کو لے کر آ جاؤں گا۔ نصرت کو تسلی دی کہ آخر وہ اس کی بھی بیٹی ہے۔ خان صاحب ملتان روانہ ہوئے اور جاتے ہی شازمہ کا نکاح اپنے بھتیجے سے پڑھا دیا۔ شازمہ بھی اس وقت اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی اور پاکستانی قانون کے مطابق وہ اپنی مرضی سے عائلی زندگی گزار سکتی تھی۔ جب خان صاحب واپس نہ آئے اور نصرت کو بھی اخبارات کے ذریعے پتہ چل گیا کہ شازمہ کی شادی ہو گئی ہے تو نصرت نے عدالت عالیہ میں مقدمہ درج کرا دیا۔ تاریخ پیشی پر خان صاحب اپنے کلاشنکوف کارندوں کے ساتھ ہائی کورٹ میں آئے۔ شازمہ نے عدالت میں بیان دیا کہ اس نے اپنی مرضی سے شادی کر لی ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ خوش و خرم ہے لہٰذا اب وہ گناہ آلودہ زندگی میں کسی طور واپس آنے کو تیار نہیں ہے۔ نصرت کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے اسمبلی ہال کے سامنے بیٹی کی واپسی کے لیے بھوک ہڑتال بھی کی سفارشیں بھی کیں لیکن بات بنی نہیں۔ اس بات کو ایک سال گزر گیا لیکن نصرت کے سینے پر بدستور سانپ لوٹتا رہا۔ ایک روز اس نے نئی سکیم بنائی اس نے فلمساز سے ہرجانے کا مقدمہ درج کرا دیا۔ ہائی کورٹ میں ایک کروڑ روپے ہرجانے کی درخواست دی گئی اور کہا گیا کہ لڑکی کے چلے جانے سے وہ فلم مکمل نہیں کر پایا جس کے باعث اسے ایک کروڑ کا نقصان ہوا ہے۔ مقدمہ کی تاریخ نکلی تو پہلی پیشی پر ہی مقدمہ خارج ہو گیا کیونکہ ایک کروڑ ہرجانے کے دعوے کے لیے ایک لاکھ کے اسٹام پیپر لگانا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ بھوکا ننگا فلمساز اپنا سا منہ لے کر رہ گیا ادھر شازمہ کی اولاد ہو گئی اور نصرت ٹھنڈی ہو کر بیٹھ گئی۔ کافی عرصہ بعد مجھے پتہ چلا کہ اب وہ ہنزہ بلاک کی شاندار کوٹھی میں رہ رہی ہے اور اپنے گھر کو کوٹھی خانہ بنا رکھا ہے جہاں مختلف لڑکیوں سے وہ جسم فروشی کرواتی ہے۔

یحییٰ خان کی عیاشی:

یحییٰ خان کا دور 1969ء سے لے کر 20 دسمبر 1971ء تک رہا تھا۔ یحییٰ خان صدر ایوب خان کے زمانے میں فوج کے جنرل تھے اور جب 1967ء میں صدر ایوب نے تاشقند میں ٹیبل پر بھارتی وزیراعظم لال محمد شاستری سے شکست کھائی تو اس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے ان کے اس فیصلے کے خلاف احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ استعفیٰ کے بعد قوم نے انہیں اپنا قائد تسلیم کر لیا اور یوں ایک زوردار عوامی تحریک فیلڈ مارشل صدر ایوب خان کے خلاف شروع ہوگئی۔ احتجاجی جلوسوں کے نتیجہ میں اس وقت کا جرنیل یحییٰ خان مارشل لاء کا نفاذ کر کے خود حکمران بن گیا۔ چند روز تک تو وہ ٹھیک رہے لیکن پھر صدارتی محل ایک عیش کدہ میں منتقل ہوگیا۔ یحییٰ خان شراب میں دھت رہنے لگے اور ان کے بستر گرم کرنے کے لیے مختلف قسم کی کال گرلز اور طوائفیں ان کے گرد جمع ہوگئیں۔ یحییٰ خان کا مقصد پورا کرنے کے لیے تین عورتیں اس کے بہت کام آتی تھیں۔ اس میں سب سے پہلے اقلیم اختر رانی تھی جو جنرل یحییٰ خان کی ہر خواہش پوری کرتی تھی۔ اسے ملک بھر سے لڑکیاں لا کر دیتی تھی اور اس طرح اس کی راتیں رنگین بناتی تھی۔ دوسری عورت فلم انڈسٹری کی مشہور گلوکارہ ملکہ ترنم نور جہاں تھی جو نہ صرف یحییٰ خان کا بستر گرم کرتی تھی بلکہ اس کا دل اپنی آواز سے بھی بہلاتی تھی۔ تیسری عورت بلیک بیوٹی کے نام سے مشہور تھی وہ شاید کسی بنگالی بیوروکریٹ کی بیوی تھی اور پر کشش اس قدر تھی کہ جنرل یحییٰ اس پر بری طرح فریفتہ تھے۔ ان تینوں عورتوں نے یحییٰ خان کی راتیں رنگین بنانے کے لیے لڑکیاں سپلائی کرنے کا کام بڑے نرالے ڈھنگ سے کیا۔ ان کے علاوہ مختلف ایکٹریسیں بھی ان کے لیے ایسی محفلیں سجاتی تھیں۔ ایک واقعہ اداکارہ ترانہ کے حوالے سے ان دنوں بہت مشہور ہوا تھا کہ ترانہ ایوان صدر میں جانے لگی تو گیٹ پر موجود سیکورٹی گارڈز نے اسے روک لیا اور بڑی مشکل سے اندر جانے دیا۔ اندر کچھ وقت گزارنے کے بعد جب وہ واپس آئی

تو ان ہی سیکورٹی گارڈز نے اسے سلیوٹ پیش کیا۔ اس پر کسی منچلے نے پوچھا بھائیو پہلے تو تم اسے جانے نہیں دے رہے تھے اور اب سلیوٹ کر رہے ہو یہ کیا انقلاب ہے؟ اس پر ایک سیکورٹی گارڈ نے برملا جواب دیا ''پہلے وہ صرف ترانہ تھی لیکن صدر سے ملنے کے بعد قومی ترانہ ہوگئی ہے۔''

یحییٰ خان کے زمانے میں جب پاکستان دولخت ہوگیا اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا تو پاکستان ٹوٹنے کی وجوہات میں ایک وجہ یحییٰ خان کی عیاشی بھی تھی۔ بھارت کے ایک ویکلی جریدے ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' نے لکھا تھا ''تین عورتیں جنہوں نے پاکستان کو توڑا ان تینوں عورتوں میں جنرل رانی، میڈم نور جہاں اور بلیک بیوٹی کے نام شامل تھے۔'' پھر جنرل رانی اور نور جہاں کی تو تصویریں بھی یحییٰ خان کو شراب پلاتے ہوئے اخبارات میں شائع ہوئی تھیں۔ ایسی ہی تصاویر روزنامہ ''مساوات'' میں عباس اطہر نے شائع کی تو اسی روز ایک فلمی سٹوڈیو میں ملکہ ترنم نور جہاں سے میری ملاقات ہوئی۔ مجھے دور سے دیکھ کر چلائی ''وے تیرے اخباروں تے میں جتی وی نہیں ماردی۔ جتنی مرضی تصویراں چھاپی جاؤ'' اور پھر کچھ عرصہ بعد تو میڈم نور جہاں کے سابق شوہر سید شوکت حسین رضوی نے اس کی تمام زندگی کی کہانی چھاپ دی تھی۔

جہاں تک جنرل رانی کا تعلق ہے وہ لاہور کی خوبصورت ترین لڑکیاں یحییٰ خان کے پاس لے کر جاتی تھی اور اس کے عوض نہ صرف رقم بٹورتی تھی بلکہ بڑے بڑے کام بھی نکلواتی تھی۔ ماڈل ٹاؤن کے قریب اس کا بہت بڑا کوٹھی خانہ تھا۔ بھٹو دور میں جب وہ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں موجود تھی تو اس کے کمرے پر چھاپہ بھی پڑا اور اسے گرفتار بھی کیا گیا لیکن پھر اس کی ضمانت ہوگئی۔ ہیروئن سمگل کرنے کے الزام میں وہ امریکہ میں قید بھی رہی۔ وہ جنس کے ہاتھوں مجبور عورت تھی اور امریکی حکومت نے اس کی استدعا پر اس کو تین حبشی دیئے ہوئے تھے جو ہفتہ میں دو بار اس کے ساتھ سیکس کرتے تھے۔ اس نے اپنے ایک دوست (جو اس وقت ایک ریٹائرڈ جج

ہے) کو خط بھی لکھا تھا جس میں بتایا تھا کہ جب تین حبشی بیک وقت اس کی خواہش پوری کرتے ہیں تو پھر اس کی تسلی ہوتی ہے۔

جنرل رانی یوں تو خراب عورت تھی لیکن اس نے اپنی اولاد کو بڑا قابل بنایا۔ اس وقت جرنلزم اور شوبز میں اس کی اولاد کے بڑے بڑے نام ہیں۔

لکھنؤ کے نواب جان عالم (واجد علی شاہ) کے طوائف آباد کی طرح محمد شاہ رنگیلا نے پنجاب میں موجود چمبہ نامی علاقے میں عورتوں کی تجارت کو فروغ دیا۔ یہاں بہت عرصہ تک خوبصورت عورتیں مختلف علاقوں سے چن چن کر لائی جاتی تھیں۔ مہاراجہ پٹیالہ جب فوت ہوئے تو اس کی تین سو(300) سے زائد بیویوں کو 35 روپے کے حساب سے اسی جگہ چمبہ میں فروخت کیا گیا تھا۔

عورتوں کی ناجائز تجارت:

زمانہ جہالت سے اب تک دوسری اجناس کی طرح عورت کو بھی جنس کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مختلف ممالک کی عورتوں کو دوسرے ممالک میں ناجائز طور پر لیجانے کا کاروبار معمول رہا۔ دوران جنگ فاتح قوموں نے شکست خوردہ قوموں سے جہاں دیگر مال لوٹا وہاں عورتوں کو بھی مال غنیمت کے طور پر بانٹا جاتا رہا۔ موجودہ زمانے میں برصغیر خاص کر جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں عورتوں کی سمگلنگ کا کاروبار زوروں پر ہے۔ ان ممالک میں سارک ممالک نیپال، انڈیا، بھوٹان، بنگلہ دیش، سری لنکا، پاکستان اور بنگلہ دیش شامل ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ برما اور افغانستان بھی ہندوستان کا حصہ تصور کیا جاتا تھا لیکن قیام پاکستان سے قبل 1937ء میں برما کو ایک آزاد ریاست کا درجہ دے کر ہندوستان سے الگ کر دیا گیا۔

جنوبی ایشیا میں سب سے زیادہ عورتوں کی سمگلنگ پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان براستہ بھارت اور نیپال ہوتی ہے۔ پھر سری لنکا کی لڑکیاں بھارت سے لائی جاتی ہیں۔ اسی

وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک لاکھ 60 ہزار کے قریب نیپالی لڑکیاں بھارت کے مختلف شہروں کے کوٹھی خانوں اور قحبہ خانوں میں اپنا کاروبار کر رہی ہیں۔ اس طرح گزشتہ دس سال کے دوران دو لاکھ کے لگ بھگ بنگالی لڑکیوں کو ناجائز طور پر پاکستان لایا گیا ہے۔ پھر سو سے ڈیڑھ سو تک لڑکیاں روزانہ ہی سمگل ہو کر پاکستان آتی ہیں۔ بنگلہ دیش اور برما کی زیادہ تر لڑکیاں اغوا کر کے لائی جاتی ہیں۔ وہ اس طرح کہ ان کے غریب والدین کو مل کر ایجنٹ قسم کے لوگ ان سے نکاح کر لیتے ہیں اور کراچی میں لے آتے ہیں اور پھر انہیں زندگی بھر کے لیے کوٹھی خانوں اور قحبہ خانوں کی زینت بنا دیتے ہیں۔ ان دونوں ملکوں کی لڑکیاں 15 سو سے 25 سو ڈالر تک عمر کے لحاظ سے فروخت کر دی جاتی ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ 80 فیصد بنگالی اور 14 فیصد برمی لڑکیاں کراچی میں غیر قانونی طور پر رہائش پذیر ہیں جبکہ 15 سو بنگالی خواتین جیل میں ہیں اور دو لاکھ کے قریب بچے اور عورتیں اس ظالمانہ تجارت میں جکڑے ہوئے ہیں۔ (یہ اعداد وشمار کراچی کی ایک این جی او (لائیرز فار ہیومن رائٹس اینڈ لیگل ایڈ کے ہیں)۔

کراچی کی اس گرے مارکیٹ سے پولیس 16 سے 20 فیصد تک بھتہ لیتی ہے۔ پاکستان کی بارڈر فورس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے کارکنوں کو پتہ ہے کہ پاکستان میں لاہور، قصور، بہاولپور، چھور اور بدین کے کن مقامات سے ان کا داخلہ ہوتا ہے۔ پاکستان پہنچنے پر ان کی نیلامی ہوتی ہے اور جو زیادہ مول دے اس کے ہاتھ نیلام کر دیا جاتا ہے۔ ان لڑکیوں کو خریدنے والے گاہکوں کی تین اقسام ہیں۔ ان میں عربی شیوخ، تاجر، سیاح اور ایسے طلباء شامل ہیں جنہیں ان کے ملکوں نے وظائف دیئے ہوئے ہیں۔ دوسری قسم مقامی جاگیرداروں اور اشرافیہ کی ہے۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو ان سے نکاح کر لیتے ہیں اور پھر ان کے دام کھرے کرتے ہیں۔ ان میں یتیم لڑکیاں بھی ہوتی ہیں ان کا نکاح عارضی طور پر عرب شیوخ سے کر دیا جاتا ہے اور پھر وہ اچھے خاصے دام دے کر انہیں یہیں چھوڑ جاتے ہیں۔

گزشتہ 26 سال کے دوران حکومت پاکستان نے جنسی استحصال کرنے والوں کے

خلاف کاروائی کے لیے تین کمیشن قائم کیے۔کمیشن نے جو رپورٹیں پیش کی اور جو سفارشات مرتب کیں ان پر آج تک عمل نہیں ہو سکا جبکہ پولیس نے جب بھی ایسی عورتوں کو دوسروں کے ساتھ دیکھا ان کے خلاف حدود آرڈی نینس کا مقدمہ درج کر دیا۔اور پھر جو بچے اور عورتیں اس قانون کے تحت گرفتار ہوئیں انہیں جیلوں میں سڑتے برسوں ہو گئے جبکہ ان کے دلال اور ان کے سرپرست انہیں جیل میں باقاعدگی سے ملتے رہے اور انہیں خوف زدہ کرتے رہے۔پھر ہماری جیلیں ایسی ہیں جہاں اصلاح کی بجائے ان کو مزید گندگی میں دھکیل دیا جاتا ہے۔بعض لوگ انہیں ضمانت پر رہا کرا کے ان کو باقاعدہ قحبہ خانوں کی زینت بنا دیتے ہیں اور پھر ان لڑکیوں کو دلالوں کی شرائط پر ہی چلنا پڑتا ہے۔غربت اور ضرورتیں عام لڑکیوں کو بھی ایسے لوگوں کی مرہون منت بنا دیتی ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ جو لڑکیاں یا بچے سمگل ہو کر آتے ہیں انہیں اسی قانون کے تحت گرفتار کیا جائے تا کہ ان کے خلاف جرائم کے مقدمات درج کیئے جائیں۔پھر فیکٹریوں میں کام کرنے والی عورتوں کو جنسی طور پر ہراساں کرنے والوں کے خلاف بھی قانون بنایا جائے۔اور اسی قدر تعلیم اور جاگرتی عام کی جائے کہ عام عورت،لڑکی اور ورکنگ ویمن اس سے مستفید ہو سکے۔

خواتین کو ہراساں کرنے کے خلاف قانون کا نفاذ:

صدر آصف زرداری نے ملازمت پیشہ خواتین کو ہراساں کرنے کے خلاف اور ان کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے بل 2010ء پر دستخط کر دیے ہیں۔اس بل کو اب قانون کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے جس کے مطابق اب ہر ادارہ ایک ضابطہ اخلاق بنائے گا اور خواتین کو کام کی جگہ پر کسی بھی صورت میں ہراساں یا پریشان نہیں کیا جا سکے گا۔بل کے تحت وفاقی اور صوبائی سطح پر خواتین کے لیے محتسب کا تقرر کیا جائے گا۔ ہر ادارہ خوتین کے لیے شکایات یا اپیل درج

کرانے کا طریقہ کار وضع کرے گا۔نجی ٹی وی کے مطابق قانون کے تحت ملازمت پیشہ خواتین کو دفاتر یا کام کرنے کی جگہوں پر جنسی طور پر ہراساں کرنے کے مرتکب افراد کو تین سال قید اور پانچ لاکھ جرمانہ تک کی سزا دی جائے گی۔ بل پر دستخط کرنے کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے صدر زرداری نے کہا کہ انسانی تاریخ میں خواتین نے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے۔میری والدہ اور بیوی مجھ سے زیادہ مضبوط خواتین تھیں جس پر مجھے کوئی شرمندگی نہیں ہے۔تمام مذاہب خواتین کو حقوق اور احترام دینے پر یقین رکھتے ہیں۔ہم محترمہ شہید کی سوچوں کو آگے لے کر چل رہے ہیں۔پیپلز پارٹی مفاہمت کی سیاست پر یقین رکھتی ہے۔خواتین کی بہتری اور انہیں بااختیار بنانے کے لیے بینظیر بھٹو کے وعدے پر عمل کیا جائے گا۔ہمیں ایسا پاکستان تخلیق کرنا ہے جہاں آنے والی نسلیں، میری بیٹیاں اس حقیقت پر فخر کر سکیں کہ وہ مساوی حیثیت کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہیں۔خواتین کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں جو مردوں کو حاصل ہیں۔صدر نے کہا کہ ان کی دونوں بہنیں پارلیمنٹ کی رکن ہیں جبکہ ان کی دونوں بیٹیاں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے بھائی کے ساتھ قوم کی خدمت کے لیے میدان میں آئیں گی۔

ہیرامنڈی

ہیرا منڈی راوی کی ہم عمر ہے۔ رنجیت سنگھ کی حکومت کو جب زوال آنا شروع ہوا تو موجودہ جگہ پر اس کا آغاز ہوا ورنہ لاہور میں چکلہ کی ابتدا بقول احمد بشیر لنڈا بازار سے ہوئی تھی۔ لنڈے بازار کا نام بھی لنڈے اور چھڑوں کے نام کی وجہ سے پڑا کیونکہ آوارہ نوجوان اسی بازار میں جا کر ناچ گانا اور جنسی تسکین حاصل کرتے تھے۔ پھر یہ کسبیاں انار کلی بازار میں آ گئیں جسے رسالہ بازار کہا جاتا تھا اور جس کے قریب فوج رہتی تھی۔ اس کے اردگرد مغلوں کی سرکاری عمارتیں یا کھنڈر تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں شہر لاہور کا نصف حصہ چکلہ تھا کیونکہ چوک چکلہ سے انارکلی تک طوائفیں بیٹھا کرتی تھیں۔ لاہور میں طوائفوں کی زیادہ تعداد ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ حملہ آوروں کی گزرگاہ تھا۔ ظاہر ہے حملہ آور جہاں جاتے ہیں وہاں طوائفوں کو جنم دیتے ہیں کیونکہ جب کوئی شہر فوج کی زد میں ہو وہاں اس کی دولت ہی نہیں عورتوں کی عصمت بھی لٹتی ہے۔ فاتحین چکلے بناتے اور مفتوحین طوائفیں جنتے ہیں۔

برصغیر ہندوپاک میں چار بڑے چکلوں میں سے لاہور کی ہیرا منڈی چوتھے نمبر پر رہی ہے۔ جیسا کہ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اول کلکتہ، دوم بنگلور، سوئم ممبئی اور چہارم لاہور۔ تب کلکتہ میں ایک لاکھ طوائفیں تھیں ان میں سے 95 فیصد ٹیکسیاں تھیں۔ اب یہ صورتحال تقریباً ہر شہر میں ہے کیونکہ مہنگائی، غربت اور ضروریات زندگی کی عدم دستیابی نے عورت کو سستے داموں جسم بیچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لاہور میں اس وقت صورت حال یہ ہے کہ محلوں سے نکل کر ملازمت کے

بہانے لڑکیاں جسم بیچتی ہیں۔ پھر دیہات اور شہر کے دور دراز کی بستیوں کی لڑکیاں اور طوائفیں بھی شاپنگ کے بہانے چند ٹکوں کی خاطر دوکانداروں، مزدوروں یا جو بھی ایک سو سے دوسو روپے خرچ کر سکے اپنا جسم پیش کر دیتی ہیں۔

لاہور کی ہیرا منڈی کئی بازاروں اور کئی محلوں پر مشتمل ایک قصبے کے برابر رہی ہے۔ یہ سطح لاہور کی ہر حصے سے بلند ہے۔ 1962ء تک ہیرا منڈی جو کہ ایک تکون کی شکل میں تھی عالمگیری مسجد اور اکبری قلعہ کے بائیں سمت بالا خانوں کی دور تک پھیلی ہوئی ایک قطار کی شکل میں تھی لیکن اب یہاں رہائشی مکان ہیں اور اسے شاہی محلہ کہا جاتا ہے۔ اب طوائفیں کم ہی رہ گئی ہیں سازندوں اور گانے والیوں کے مکان ہیں جن میں سے زیادہ تر لاہور کے پوش علاقوں میں شفٹ ہو گئی ہیں۔ پہلے اونچا چیت رام روڈ سے طوائفوں کے کوٹھے شروع ہو جاتے تھے لیکن اب اس سڑک پر میوزک اکیڈیمیوں اور شادی بیاہ پر یا گروپوں کی شکل میں بیرون ملک طائفے بھیجنے والوں کے دفاتر ہیں۔ آج کل بازار شیخوپوریاں میں طوائفیں نہیں بیٹھتیں یہاں جوتیوں کی دکانیں ہیں یہاں کے کھسے بڑے مشہور ہیں اور بیرون پاکستان سے آنے والے یہیں سے دیسی جوتے اور کھسے خریدتے ہیں۔ ٹبی تھانے کے عقب میں کبھی ٹبی گلی ہوتی تھی جہاں طوائفیں دن دہاڑے پیشہ کرنے کے لیے بیٹھ جایا کرتی تھیں۔ اب یہاں کچھ بھی نہیں ہے بس نیچا چیت رام روڈ وغیرہ پر خفیہ کوٹھی خانے ہیں جہاں چوری چھپے جسم فروشی ہوتی ہے۔ البتہ بازار عبدالطیف میں رات کو گیارہ بجے کے بعد چند ایک طوائفیں بیٹھتی ہیں جن کا کام گاہک کا دل گانے بجانے یا رقص سے بہلانا ہوتا ہے ورنہ زیادہ تر اس قسم کی محفلیں گلبرگ یا ڈیفنس کے قحبہ خانوں میں سجتی ہیں۔ کیونکہ اب کوئی بھی امیر آدمی یہاں آنا گوارا نہیں کرتا۔ گورنر امیر محمد خان کے زمانے میں ٹبی گلی میں عصمت فروشی ہوتی تھی لیکن امیر محمد خان نے عصمت فروشی ممنوع قرار دے دی تو یہ گلی بند ہو گئی۔

ٹبی دراصل ٹبہ کا اسم تصغیر ہے۔ ٹبہ (ٹیلا) کو کہتے ہیں یہ چونکہ چھوٹا سا ٹیلا تھا لہٰذا اس کا

نام ٹبی پڑ گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ابتدائی زمانہ میں حضرت سید قاسم شاہ مشہد مقدس سے لاہور تشریف لائے تو انہوں نے اسی ٹبہ کو اپنا مسکن بنایا۔ مسجد کی بنیاد رکھی، حجرہ بنوایا اور یاد الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کے فقر کا شہرہ ہو گیا تو چیچو کی ملیاں (شیخوپورہ) کے بعض خانہ بدوشوں نے ٹبی کے نشیب میں بسیرا کر لیا۔ یہ لوگ خود کو پنجاب کی مختلف ذاتوں سے منسوب کرتے تھے ان کا کام چٹائیاں بننا اور چقیں (چلمن) بنانا تھا۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے انسان کو بعض اوقات اپنا جسم تک بیچنا پڑ جاتا ہے۔ ان کی عورتیں خوبصورت تھیں جنہوں نے چوری چھپے پیشہ کرانا شروع کر دیا بس وہیں سے یہاں جسم فروشی کا رواج ہوا۔ ہیرا منڈی کی بڑی بڑی بلڈنگوں کی مالک ان ہی خانہ بدوشوں کی اولاد ہے۔ حضرت قاسم شاہ کے فرزند حضرت میرن شاہ کا انتقال ہوا تو ٹبی کا نام کوچہ میرن شاہ پڑ گیا۔ 1920ء میں ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ علی گوہر نے اسے اپنے نام سے منسوب کیا بعد ازاں اس کا نام ٹبی گلی یا چکلہ رکھ دیا گیا۔

حضرت قاسم شاہ کا عرس ہر سال ہوتا ہے جہاں طوائفیں حاضری دیتی ہیں۔ کبھی یہاں مجرا بھی ہوتا تھا لیکن اب ایسا کچھ دیکھنے کو نہیں ملا۔ ان ہی حضرت قاسم کے برادر زادے حضرت میر حسن سیالکوٹی تھے جو علامہ اقبال کے استاد تھے۔

ہیرا منڈی اور ٹبی کے رویوں اور اقدار میں خاصا فرق تھا۔ ہیرا منڈی فن کاروں کی رہائش گاہ تھی جہاں صرف گانا بجانا یا رقص کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں جبکہ ٹبی قصاب خانہ تھا جہاں عورت کا گوشت ملتا تھا۔

ہیرا منڈی کا نام ہیرا منڈی کیوں پڑا اس بارے میں مشہور فیچر نگار، محقق اور دانشور احمد بشیر کا کہنا ہے کہ کسی زمانے میں دوسرے ملکوں یا شہروں کے تاجر یہاں آ کر ہیروں کی منڈی لگاتے تھے یعنی کہ وہ اجناس خریدنے کے لیے سونے، ہیرے یا دوسرے جواہرات دیتے تھے کیونکہ ان کے ملک کا سکہ تو یہاں چلتا ہی نہیں تھا۔ اسی بنا پر اس کا نام ہیرا منڈی پڑ گیا تھا۔ ہیرا

منڈی کی جگہ بعد ازاں شاہی مسجد کی تعمیر میں آ گئی تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سکھ شاہی کے دور میں لاہور میں کئی سکھ سرداروں نے اپنے قلعے بھی بنا لیے تھے۔ مشرق کی طرف جہاں اب میکلوڈ روڈ ہے وہاں گوجر سنگھ کا قبضہ تھا قلعہ گجر سنگھ اسی کے نام سے منسوب ہے۔ اسی طرح لچھمن سنگھ نے بھی اپنا قلعہ تعمیر کر لیا تھا اب یہ قلعہ قلعہ لچھمن سنگھ کہلاتا ہے۔ ٹبی پر ہیرا سنگھ کی حکمرانی تھی اور اسی وجہ سے یہ علاقہ ہیرا منڈی کہلایا۔

ہیرا منڈی میں نامور طوائفیں اور گانے والیاں بھی گزری ہیں۔ طمنچہ بیگم کمال کی طوائف تھی پھر الماس جس نے میاں ممتاز دولتانہ سے شادی کی۔ اس کے بعد ممتاز، شمشاد اور مختار بیگم۔ مختار بیگم تو ایک عرصہ تک آغا حشر کاشمیری کی محبت میں گرفتار رہی۔ مختار بیگم کے ہاں مشہور ادیب وصحافی مولانا چراغ حسن حسرت بھی آیا کرتے تھے۔ مولانا کے ساتھ احمد بشیر بھی ہوتے تھے اور پہلا فیچر ہیرا منڈی پر انہوں نے ہی لکھا تھا جس کو آغا شورش کاشمیری نے اپنی کتاب ''اس بازار میں'' کے لیے بنیاد بنایا۔ ''اُس بازار میں'' جب لکھی گئی تھی تو ان دنوں لوگ بھارت سے اجڑ کر لاہور آئے تھے لٹ پٹ کر آنے والوں کے ساتھ جو ناانصافیاں ہوئیں اور بڑھتی چلی گئی ان کا مداوا آج تک نہیں ہو سکا۔ اس قسم کے فقرے ان دنوں عام سننے کو ملے۔ ہندوستان سے خدا پاکستان لے آیا لیکن اس بازار میں یہ پاپی پیٹ لے آیا۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا مختار بیگم کا جو امرتسر سے آ کر لاہور آباد ہو گئی تھی اور دار وامرتسر والی کے نام سے مشہور تھی۔ مختار بیگم مشہور غزل گانے والی فریدہ خانم کی بڑی بہن تھی اور اداکارہ رانی کو بھی اسی نے متعارف کرایا تھا۔ مختار بیگم کو دکھ تھا کہ معیاری طوائف ختم ہوتی جا رہی ہے اور اب لوگ فن کے قدردان نہیں رہے صرف بازاریوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن وقت جب آگے بڑھا تو گانے والیوں کو مزید زوال آ گیا جو تھوڑی بہت فن کی دلدادہ تھیں وہ فلموں اور ٹی وی میں چلی گئیں۔ فلموں سے تو انہوں نے لاکھوں کمائے اور بڑے بڑے سیٹھوں کو گرویدہ کیا لیکن جب ٹی وی آیا تو ان کو شہرت راتوں رات ملک کے کونے کونے میں پھیل گئی اور انہوں

نے اچھے خاصے دام بنانے شروع کر دیئے۔

اکثر طوائفوں کا کہنا ہے کہ ان کا پیشہ ایک انقلابی پیشہ ہے اس کی ابتدا کیسے بھی ہوئی ہو لیکن طوائف نے ہر دور میں اچھی اور قدامت پسند قوتوں کو ڈبویا ہے۔ اس نے ہر دولت مند سے مزدور کی محنت کے استحصال کا انتقام لیا ہے۔ جو کچھ جاگیردار مزارعوں سے لوٹتے ہیں طوائف اس معیشتی استحصال کا جنسی بدلہ لیتی ہے۔ اس نے جاگیرداری نظام کی موت قریب لانے میں برابر کا حصہ لیا ہے۔ وہ ایک نسل کا انتقام دوسری نسل سے لیتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ ایک محنت کش سرمایہ دار کے لیے جو قدر زائد (Surplus Value of Labour) پیدا کرتا ہے وہ اس قدر زائد کو شب خون مار کر ہتھیا لیتی ہے۔ اس کی بدولت سرمایہ دار کی دولت گردش میں رہتی ہے۔

طوائفوں نے کتابوں کی بجائے انسان پڑھے ہوتے ہیں۔ وہ شکل دیکھ کر اندازہ لگا لیتی ہیں کہ کون کتنے پانی میں ہے؟ ہر طوائف کئی کئی خاندانوں کے رازوں کی امانت دار ہے۔ اسی کی گود میں پلنے والے بچے کسی نہ کسی معزز باپ کی اولاد ہوتے ہیں۔ ان کی مائیں ان کے باپوں کو خوب جانتی ہیں ان کے باپ بھی انہیں جانتے ہیں لیکن ولدیت کے خانے میں ماں کا نام ہی لکھا ہوتا ہے۔ شبانہ چوہدری ایک گلوگارہ ہے میں اپنے ایک کزن کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ شبانہ چوہدری کی والدہ نے بتایا ''صاحب جی آپ کو کیا پتہ کہ میں کس جاگیردار کی بیٹی ہوں اور میری بیٹی گوجرانوالہ کے کس سرمایہ دار کی لخت جگر ہے؟ ہم نے تو لوگوں کے پردے رکھے ہوئے ہیں۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ جس کسی جاگیردار کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی بیٹی جوان ہوگئی ہے اور اب دوسروں کا دل لبھائے گی تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اسے حاصل کر لے جیسا کہ شازمہ کے والد نے کیا تھا۔ اسی طرح کافی عرصہ قبل لائل پور کے چکلہ میں اداکار سدھیر کی بیٹی جوان ہونے لگی تو سدھیر نے اسے اغوا کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں کے کنجروں نے یہ کوشش ناکام بنادی تھی۔ اس لڑکی کا نام ثمرا اقبال تھا جو اب مشہور گلوکارہ ہے۔

اسی طرح میری ایک بہت عزیز اور واقف کار طوائف جو کہ مشہور گلوکارہ بھی ہے کو ایک امیر آدمی نے اپنی داشتہ رکھ لیا۔ وہ ایک سال تک اس کے ساتھ عیاشی کرتا رہا۔ اس دوران جب اس طوائف کو حمل ہوا تو وہ اچانک غائب ہو گیا۔ تماش بین جب دیکھتے ہیں کہ طوائف بچہ جننے والی ہے تو عام طور پر پردے سے غائب ہو جاتے ہیں اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس طوائف سے ایک خوبصورت بچی نے جنم لیا۔ وہ خود فرانس چلا گیا جب بچی سات سال کی ہوئی تو وہ فرانس سے ایک روز واپس آیا اور اس طوائف سے ملا کہ جتنے پیسے چاہئیں لے لو لیکن بچی مجھے دے دو کیونکہ میں نہیں چاہتا وہ تمہاری طرح رقاصہ یا گلوکارہ بنے اور لوگوں کی گود گرم کرے۔ اس پر اس طوائف نے کہا کہ میں نے 9 ماہ تک اس بچی کو اپنی کوکھ میں رکھا ہے اس دوران کسی تماش بین سے رابطہ نہیں کیا اور جو دکھ اور تکلیف میں نے اٹھائی ہے وہ 9 ماہ مجھے واپس کر دو تو بچی لے جاؤ۔ اس بات کا اس تماش بین کے پاس کوئی جواب نہیں تھا لہٰذا وہ واپس چلا گیا۔

عام طور پر طوائفوں کے ہاں جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان کی ولدیت کے خانے میں ان کے بھائیوں کا نام درج کر دیا جاتا ہے۔ میرے ایک دوست کا نام ایک طوائف کی بچی کے باپ کے طور پر سکول کے رجسٹر میں ولدیت کے خانے میں درج ہے۔

بھولی ایک شریف النفس اور خوبصورت نوجوان طوائف ہے۔ اسے اسلام آباد کے ایک جاگیردار نے اپنی داشتہ رکھا ہوا ہے جو اسے 25 ہزار روپے مہینہ دیتا ہے۔ اس میں سے بھولی کی ایک سات سالہ بچی ہے وہ اسے ایک انگریزی میڈیم سکول میں پڑھا رہی ہے۔ اس سے میری بات ہوئی تو کہنے لگی زاہد صاحب ہماری زندگی کا کیا پوچھتے ہو ہماری نتھ کھلوائی ہوتی ہے تو بڑے بڑے سرمایہ دار یا جاگیردار لاکھوں روپے ہماری ماؤں کو دیتے ہیں اور اس کے بعد تماش بین ہمیں مستقل داشتہ کے روپ میں رکھ لیتے ہیں۔ منہ مانگی دولت دیتے ہیں۔ ہماری تربیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ ہمیں پتہ ہے کہ جو تماش بین ملے اسے پہلے روز ہی ذبح کر لو کیونکہ وہ ہو سکتا ہے دوبارہ نہ آئے لہٰذا ہم ان کے میٹھے بولوں اور جھوٹے دعدوں میں کبھی نہیں آتیں۔

ہمیں ہماری مرضی کی رقم جوانی میں ہی ملتی ہے جب ہم ایک آدھ بچہ پیدا کر لیتی ہیں تو ہمیں پھر تماش بین کی مرضی سے پیسے ملتے ہیں۔ جب عمر ذرا زیادہ ہوتی ہے تو سیٹھ لوگ پہلو بچانے لگتے ہیں۔ جب ہم کمانے کے قابل نہیں رہتیں تو پھر ہماری بیٹیاں یا بھانجیاں ہمارے سپرد سبزی لانے یا دوسرے چھوٹے چھوٹے کاموں کے عوض ہمیں دال روٹی دیتی ہیں اور ہمارے سپرد مکانوں کی رکھوالی کے سوا کچھ نہیں ہوتا کیونکہ نوجوان لڑکیاں دولت اور زیورات اپنی تحویل میں لے لیتی ہیں۔

بعض طوائفیں جنہوں نے فلموں یا ٹی وی کو اپنا لیا وہ ہیرا منڈی چھوڑ کر اچھی آبادیوں میں آ گئیں انہوں نے اپنی بچیوں کو اعلیٰ تعلیم بھی دلائی۔ ان میں سے بعض نے ملازمتیں بھی کر لی ہیں۔

میں نے جب ایک پنجابی فلم کا آغاز 1983ء میں کیا تھا تو اس میں ایک نئی گلوکارہ سمیرا کو متعارف کرایا۔ بعد ازاں سمیرا، ثمینہ وغیرہ تین بہنوں نے مل کر ایک گروپ ٹرپل ایس سسٹرز کے نام سے تشکیل دیا۔ اس گروپ نے گلوکاری کے ذریعے لاکھوں روپے کمائے پھر شادیاں کر لی۔ ان کا ایک بھائی خلیل حیدر اچھا گلوکار ثابت ہوا اس کا یہ گیت کافی مشہور ہوا:

اب کپڑے بدل کر جاؤں کہاں
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا
اب بال بناؤں کس کے لیے

اس کا چھوٹا بھائی ایک مقامی اخبار میں سب ایڈیٹر ہے یوں انہوں نے نہ صرف اپنا پیشہ بدل لیا بلکہ حالت بھی بدل لی۔

نوے فیصد طوائفیں اب ہیرا منڈی میں ڈیرے جمانے کے بجائے دبئی، ابوظہبی، العین، شارجہ اور لندن وغیرہ میں جانے والے طائفوں میں رقص یا گلوکاری کے لیے جاتی ہیں

جہاں وہ لاہور سے اچھے خاصے پیسے کماتی ہیں۔ پونڈ چونکہ 110 روپے کا ہے لہٰذا اگر وہ تین ماہ میں چار ہزار بھی کماتی ہیں تو پاکستان آ کر ساڑھے چار لاکھ روپے ہو جاتے ہیں جوان کے ایک سال یا چھ ماہ کے اخراجات کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ پھر پاکستان میں بھی سٹیج شو یا شادیوں اور مختلف تقریبات میں مجرا کر کے ہزاروں کما لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہیرا منڈی کا صرف نام ہی رہ گیا اور زیادہ تر طوائفوں نے یہاں سے ڈیرے اٹھا لیے ہیں۔

✿

طوائفوں کی ذاتیں

شازمہ کی والدہ نصرت اپنی ذات کا بار بار ذکر کیا کرتی تھی وہ کہتی تھی کہ ہم ''اجلے'' ہیں اور یہ طوائفوں کی سب سے اونچی ذات ہے لیکن دیگر طوائفیں اپنے آپ کو بہتر سمجھتی تھیں۔ سب سے کم ذات ٹکیاؤں کی تھی۔

واجد علی شاہ نے اپنے زمانے میں ایک ایسے لکھنؤ کو جنم دیا تھا جو عیش ونشاط کا گہوارہ بن کر خود ایک کسبی ہو گیا تھا یعنی کہ اس کی حیثیت ایک پیشہ ور طوائف کی تھی۔ اُن دنوں لکھنؤ میں رنڈیوں کے تین طبقے تھے:

کنچنیاں:

یہ پیشہ ور عورتیں تھیں جنہوں نے پنجاب سے نقل مکانی کر کے فیض آباد میں ڈیرے ڈال لیے تھے اور ان کی وجہ سے ہی چکلہ آباد تھا۔

چونہ والیاں:

یہ دوسرے درجہ کی طوائفیں تھیں جنہوں نے گانے بجانے اور ناچنے کو پیشہ بنایا تھا اور ان کی آواز کمال کی ہوتی تھی۔ آجکل ان کو آرٹسٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ناگرنیاں:

ان میں ہر قوم کی فاحشہ عورتیں شامل تھیں ان کے کوٹھی خانے تھے ان سے ہر کوئی مستفید

ہو سکتا تھا۔

ناچنے والیوں میں فلم سٹار نرگس کی ماں جدن بائی اس محفل کی آخری شمع تھی اسے مور پنکھی ناچ میں کمال حاصل تھا۔ ہم نے 1972ء میں فلموں کی رقاصہ نجمہ رومانی کو یہی ڈانس مغل ہوٹل اور فلیٹی میں کرتے دیکھا تھا۔

طوائفوں کی مخصوص بولیاں:

طوائفوں کا کام چونکہ خطرات سے خالی نہیں ہوتا اس لیے جو طوائفیں صرف رقص یا گلوکاری کی عادی ہوتی ہیں وہ آسانی سے جسم فروشی کی طرف نہیں آتیں۔ وہ تماش بینوں یا عام آدمیوں سے بعض باتیں خفیہ رکھتی ہیں کیونکہ نائکہ طوائفوں کو اگر سب کے سامنے ہدایات دے تو ان ہدایات کا پتہ تماش بینوں کو بھی لگ جاتا ہے۔ ایسے میں انہوں نے گفتگو کے لیے ایک مخصوص بولی ایجاد کر رکھی ہے۔ ہو سکتا ہے ایسی بولی دوسری زبانوں میں بھی ہو لیکن پنجاب کی طوائفوں نے پنجابی زبان میں یہ بولی ایجاد کی ہوئی ہے جس کے چیدہ چیدہ الفاظ یوں ہیں۔

عام طور پر آپ لوگوں نے کسی نائکہ کو کہتے سنا ہو گا۔ ''لُورا بھونڈا اے'' لورا ہیرامنڈی کی زبان میں مرد یا لڑکے کو کہتے ہیں اور بھونڈا بُرے الفاظ میں استعمال ہوتا ہے مثلاً مخصوص

الفاظ		معانی		
لُورا	۔	مرد یا لڑکا	=	نارو کاٹ۔ شراب
لوری	۔	عورت یا لڑکی	=	کوڑ۔ بدذوق
بھونڈا	۔	بُرا	=	سُجھدی والا۔ باذوق
چسا	۔	اچھا		
جھپن	۔	ڈرنا	=	دھور۔ اچھا

چھتوانی — طوائف

دھورے — پیسے = سیرنا۔ پیسے لینا

چام — دیکھنا = چامکا۔ دیکھنے والا یا ٹھرکی

لورا دھورا ے — (لڑکا پیسے والا ہے)

لورا ہنوا ے — (لڑکا یا تماش بین بھوکا ننگا ہے)

نتھی رہ — چپ کر جا

بھونڈی نہ خطا — (بری بات نہ کر)

لور یئے نتھی رہ — لورا بھونڈا اے جیبڑے گا (اے لڑکی تو چپ رہ۔ یہ تماش بین ٹھرکی ہے یا خراب ہے اے مارے گا)

لور یئے لورے کو دھورے سیر (اے لڑکی اس تماش بین سے پیسے مانگ)

ہیرا منڈی میں ہی مجھے ایک پڑھے لکھے شخص نے بتایا کہ ہمیشہ تین افراد سے بچ کے رہنا چاہیے۔ یہ لوگ کسی کے ساتھ مخلص نہیں ہوتے۔ نمبر (1) نائکہ (2) پہلوان (3) پولیس والا

(نائکہ کی نظر ہمیشہ تماش بین کی یا ہر شخص کی جیب پر ہوتی ہے کہ اس نے کس طرح پیسہ حاصل کرنا ہے اس سلسلہ میں وہ کسی رشتے کا احترام نہیں کرتی۔

پہلوان جب کھانے پر بیٹھے تو وہ کسی کو دعوت نہیں دے گا کیونکہ وہ اپنے کھانے میں کسی کو حصہ دار نہیں بناتا۔ اس کو وہم ہوتا ہے کہ اگر اس نے ساتھ والے کو کھانے کے لیے کہا تو خود بھوکا رہ جائے گا۔

پولیس والا ہمیشہ دوسرے کو مجرم سمجھتا ہے اور وقت پڑنے پر دوست کو بھی ہتھکڑی لگانے سے باز نہیں آتا۔

میں اس میں صحافی کو بھی شامل کرتا ہوں کیونکہ صحافی بھی (شرط یہ ہے کہ بنیادی طور پر صحافی ہو) دوست کے خلاف لکھ دیتا ہے۔

عقیدہ، خیرات اور رسمیں

ہیرا منڈی جہاں کسی زمانے میں 6 ہزار کے قریب کسبیاں رہتی تھیں آج کل سخت مشکلات کے باعث ان کی تعداد کم ہو کر دو ہزار رہ گئی ہے۔ یہ دو ہزار بھی شہر کے مختلف علاقوں میں پھیل چکی ہیں کیونکہ اب یہاں تماش بین کم ہی آتے ہیں اور گانے کی محفلیں بھی پوش علاقوں میں ہی منعقد ہوتی ہیں۔ جب ہیرا منڈی عروج پر تھی اور برصغیر میں اس کے مقابلہ کا کوئی چکلہ نہیں تھا تو ہیرا منڈی کی لڑکیاں رات کو سج بن کر اور سولہ سنگھار کر کے نکلتی پھر جا کر اپنے کمروں میں دفتر سجا لیتی تھیں۔

تمام طوائفیں چونکہ احساس گناہ کا شکار ہوتی ہیں لہٰذا معذوروں، گداگروں اور ملنگوں وغیرہ کو خیرات سے نوازتی رہتی ہیں یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ عقیدہ کے لحاظ سے تمام فقہ جعفریہ سے تعلق رکھتی ہیں اور تقریباً تمام مزاروں پر عقیدت سے جاتی ہیں۔ کچھ مزار تو ہیرا منڈی کے درمیان میں ہی موجود ہیں اور کچھ باہر ہیں۔ ہر جمعرات کو بی بی پاک دامناں پر حاضری دینا ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح شاہی مسجد اور لیڈی ولنگٹن ہسپتال کے درمیان میں واقع صابر شاہ کے مزار پر بھی منت مانگنے جاتی ہیں۔

بابا صابر شاہ کون ہے؟ کہا جاتا ہے کہ جب احمد شاہ ابدالی لاہور پر حملہ کرنے کے لیے روہتاس پہنچا تو صابر شاہ جو کہ اس کا مرشد تھا وہ بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ صابر شاہ نے احمد شاہ سے کہا کہ میں لاہور کو برباد ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا لہٰذا میں وہاں کے حکمران شاہ نواز کو سمجھاتا ہوں

چنانچہ لاہور آ کر اس نے اپنے ماں کے پاؤں چھوئے اور پھر تمام بزرگوں کے مزاروں پر گیا اور ایک روز آواز بلند کی کہ احمد شاہ آ رہا ہے تم اپنے ظلموں سے باز آ جاؤ۔ شاہ نواز کے مخبروں نے اسے اطلاع دی تو اس نے درویش کو سیسہ پگھلا کر رس میں پلا دیا اور اسی طرح صابر شاہ کی موت واقع ہوگئی۔ یہ واقعہ 1748ء کے لگ بھگ ہوا۔ لوگوں نے اس کو اس کھلے میدان میں دفن کر دیا۔ اس مزار کے متولی کے طور پر آصف جاہ رہے جو پنجابی فلموں میں کامیڈی کردار کرتے تھے۔ وہ فوت ہوئے تو انہیں بھی اسی جگہ دفن کیا گیا۔ ان کی فلم شیخ چلی کافی مشہور ہوئی تھی اس کے علاوہ چاچا خواہ مخواہ، چوہدری، گمنام، قاتل، من موجی، ولایت پاس، تیس مار خان، مرزا جٹ وغیرہ میں انہوں نے یادگار کردار ادا کیے۔

اس طرح روشنی دروازے کی طرف سے چوک کی طرف آتے ہوئے راستے میں نوگزے کی قبر ہے اور پانی والا تالاب کی طرف جاتے ہوئے ایک اور بزرگ کا مزار ہے۔ جہاں پاکستان کے مشہور شاعر فقیر منش ساغر صدیقی سارا دن بیٹھا کرتے تھے۔ انہوں نے لکھا تھا:

جس دور میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس دور کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

ساغر صدیقی سے فلم سولہ آنے کے گیت لکھوانے کے لیے ایک بار انور کمال پاشا انہیں اپنے دفتر لے گئے۔ انہیں نہلایا دھلایا نئے کپڑے سلوا کر دیئے اور ایک کوٹھی میں رہنے کو جگہ دی۔ ان سے گانے لکھوانے شروع کئے اور انہیں تلقین کی کہ اب یہیں رہیں۔ لیکن ایک رات ساغر صدیقی غائب ہو گئے اور واپس نہ آئے۔ انور کمال پاشا کے آدمیوں نے انہیں ڈھونڈنا شروع کیا اور وہ بڑی مشکل سے ہیرا منڈی کے اس مزار میں چرس پیتے ہوئے ملے انہیں لیجانے کی کوشش کی گئی تو وہ بولے حرامزادو فقیر کو خراب کرنا چاہتے ہو۔ ہمارا اوڑھنا بچھونا تو یہ

مزار ہے ہمیں کوٹھیوں اور بنگلوں سے کیا غرض؟ طوائفیں ہر سال حضرت شہباز قلندر اور امام بری کے مزار پر حاضری دینے بھی جاتی ہیں۔

رسم ورواج اور مرشد کی سیوا:

ایک زمانہ تھا کہ رنڈیاں یا طوائفیں جو کچھ کماتی تھیں وہ کھلے بندوں خرچ کر دیتی تھیں۔ان کی کمائی جس راستے سے آتی تھی اسی راستے میں نکل جاتی تھی یعنی کہ (Easy Come Easy Go)

مال حرام بود و بجائے حرام رفت

کچھ لگے بندھے لے جاتے۔ کچھ نشوں کی نذر ہو جاتا، کچھ اسراف کے چولھے میں پُھک جاتا ہے، کچھ جوئے میں ہار جاتا ہے اور جو تھوڑا بہت بچتا ہے وہ رسموں کے پیٹ میں اتر جاتا ہے۔ بیاہ شادیوں، سالگراؤں اور مونڈنوں میں تباہی مچتی ہے۔طوائفوں کے ہاں خوشی کی رسم بڑے ٹھاٹھ سے منائی جاتی ہے۔ایک ایسی ہی رسم کے موقع پر ایک روز میں نے اپنے فورٹ روڈ والے آفس میں بیٹھے ہوئے دیکھا کہ ایک رنڈی اور اس کی سہیلیاں شادی کے دعوت نامے لئے ہر گھر میں جارہی تھیں۔ ہمارے ہاں بھی آئیں تو وہاں بیٹھے ہوئے ایک طوائف زادے نے جب دعوتی کارڈ وصول کیا تو اسے پانچ سو روپے کا نوٹ نذرانے کے طور پر دیا۔ایسے ہی میرے ایک دوست کے چھوٹے بھائی کے بیٹے کی رسم منگنی گلشن راوی کے ایک شادی ہال میں ہوئی تو رات گئے نہ صرف گانا بجانا اور رقص وسرور ہوتا رہا بلکہ کھلے بندوں ان پر نوٹ بھی نچھاور کئے گئے۔ایک اور ہمارے دوست کی بیٹی کی رسم سالگرہ ہوئی اور مختلف قسم کے کھانوں کے انبار کے علاوہ مجرا بھی رات گئے تک چلتا رہا اور اس میں کنچنیوں نے کھلے بندوں نوٹ نچھاور کئے۔طوائفوں کے ہاں کوئی خوشی ہو تو اس میں ساری برادری شریک ہوتی ہے۔ مختلف قسم کے کھانے پکتے ہیں اور سینکڑوں آدمی شکم سیر ہو کر کھاتے ہیں۔ یہاں ہر رسم کو بھرپور طریقے سے منایا جاتا ہے۔پھر ختم شریف وغیرہ کے موقع پر بھی ہر ایک کو کھانے کی دعوت عام

ہوتی ہے۔تنویر جاوید جو آج کل مختلف ممالک میں طائفے لے کر جاتے ہیں ہر جمعرات کو کھانے کی دیگ پکاتے ہیں اور محرم کے دنوں میں تو روزانہ ہی دس روز تک لنگر جاری رہتا ہے۔عین چوک میں سبیل لگائی جاتی اور اعلیٰ قسم کا کھانا بھی پکایا جاتا ہے۔طوائفیں چونکہ ہر وقت احساس جرم کا شکار ہوتی ہیں لہٰذا پیروں فقیروں کی خدمت کرنا ثواب سمجھی ہیں۔مرشد کا لکھا پتھر پر لکیر کے مترادف ہوتا ہے چاہے کوئی کام ہو یا نہ ہو۔کام ہو گیا۔کامیاب مجرا کیا یا باہر کا کوئی طائفہ کافی مال لایا تو یہ سب مرشد کی مہربانیوں اور دعاؤں کے صدقے ہوتا ہے۔لیکن خدانخواستہ اگر کام بگڑ گیا مجرا ٹھنڈا یا ماٹھا رہا اور گروپ کو نقصان ہوا تو اسی میں کسی نہ کسی طوائف کی اپنی غلطی کا دخل ہوتا ہے۔یہ جس قدر تماش بینوں کو لوٹتی ہیں انہیں کند چھرے سے ذبح کرتی ہیں اسی قدر اپنے بڑوں، بچوں، رشتے داروں اور پیر و مرشد کا خیال رکھتی ہیں۔

ہیرا منڈی کا اُجڑنا:

جنرل ضیاء الحق کے دور میں ہیرا منڈی اجڑنا شروع ہوئی۔ویسے تو پانچویں دہائی میں ہیرا منڈی کے مکین شہر کی مختلف حصوں میں پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ہیرا منڈی کے بالکل سامنے موہنی روڈ کے قریب باغ منشی لدھا میں بعض امیر طوائفوں نے پلاٹ لے کے مکان تعمیر کرنے شروع کر دیئے تھے۔ان میں سب سے پہلے مشہور کرکٹر نذر محمد (جو مدثر نذر کے والد تھے جو ملکہ ترنم نور جہاں کے عشق میں ٹانگ تڑوا بیٹھے تھے) منتقل ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ تقریباً تمام کنجر ہی اس طرف منتقل ہو گئے ورنہ کبھی شاہی محلہ اور فورٹ روڈ تک ہی محدود ہوتے تھے۔اب جو طوائفیں ایک آدھ دفتر سجانے آتی ہیں وہ اسی محلہ سے آتی ہیں۔اس محلے کا نام کریم پارک بھی ہے۔اس محلہ میں لوئر مڈل کلاس کی طوائفیں رہتی ہیں جبکہ امیر طوائفیں ڈیفنس اور علامہ اقبال ٹاؤن سے سج سنور کر آتی ہیں۔

نتھ کھلوائی:

ایک زمانہ تھا کہ طوائف کی نتھ کھلائی کی رسم بڑے زور وشور سے ہوتی تھی شاید اب بھی ہوتی ہو۔ ہوتا یوں ہے کہ جب لڑکی بارہ یا تیرہ برس کی ہوتی ہے تو اس کو سونے یا چاندی کی ایک نتھ پہنادی جاتی ہے جو اس کے کنوارے پن کی علامت ہوتی ہے۔ نتھ کھلوائی کا مطلب ہے کہ وہ اپنے نئے پیشے کا آغاز کر رہی ہے۔ امیدواروں میں جو امیر ترین ہوتا ہے یا سب سے زیادہ دام لگاتا ہے وہ اس رسم کو ادا کرتا ہے۔ ادائیگی کا انحصار لڑکی کی خوبصورتی پر ہوتا ہے۔ اس موقع پر وہ تمام رسومات ہوتی ہیں جو شادی بیاہ پر کی جاتی ہیں۔ کنجر صرف اسی لڑکی کی نتھ کھلواتے ہیں اور اسے مجرے یا گانے کے لیے بٹھاتے ہیں جو معاشرے کے کسی صاحب ثروت یا جاگیردار کی بیٹی ہوتی ہے ورنہ جب وہ اپنے کسی لڑکے کی شادی کرتے ہیں تو وہ بہو کو سات پردوں میں رکھتے ہیں اور اس کی شکل بھی دوسرے لوگ نہیں دیکھ سکتے بلکہ وہ بوڑھی ہو کر بھی پرائے مرد کے سامنے نہیں جا سکتی۔ جب کسی بیٹی کی رسم نتھ کھلوائی ہوتی ہے تو دو تین روز تک پر تکلف دعوتیں ہوتی ہیں غریبوں میں کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔ یوں لڑکی کے لیے یہ ایک یادگار موقع ہوتا ہے۔ نتھ کھولنے والا ان کا ایک قسم کا داماد بن جاتا ہے۔

طوائفوں کے بطن سے پیدا ہونے والی لڑکیاں عام طور پر طوائفوں کا پیشہ ہی اختیار کرتی ہیں ورنہ اپنی اولاد کو وہ اس طرف نہیں آنے دیتے۔

اب بھی اگر ہیرا منڈی میں بوڑھی طوائفوں کو دیکھیں ان میں سے اکثریت سگریٹ پھونکتی اور شراب پیتی نظر آئے گی۔ بعض ماؤں کو جوئے کا چسکا ہے۔ پھر خود بھی جواء اور ریس کھیلتی رہتی ہیں۔ یہ تمام بازار شرفاء کی کیاریوں سے ہی بھرا رہتا تھا۔

شادیوں بیاہوں میں گانے کا رواج 1945ء میں ہو چکا تھا۔ بڑی بڑی طوائفیں نوابوں یا امراء کے گھروں میں ہونے والی محفلوں میں گانے اور مجرا کے لیے جاتی تھیں۔ آغا حشر

کاشمیری کی مختار بیگم کا چرچا تھا۔اسی طرح طمنچہ بیگم کا مجرا دیکھنے کے لیے بڑے بڑے لوگ یا تو اس کے دروازے پر آتے تھے یا پھر اسے گھر میں بلا لیتے تھے۔وہ خوبصورت لباس اور دلنشین اشاروں سے گاتے ہوئے حاضرین کا دل موہ لیتی تھی۔

ستر کی دھائی میں ہیرا منڈی کی چھم چھم، پنا بیگم، فریدہ، مینا چوہدری، نگو پھر فردوس نے بھی بڑا نام کمایا۔

چھم چھم کی رسائی تو عرب امارات کے شیوخ تک بھی تھی اور اسی کا بھائی اعجاز ہر جوان ہونے والی طوائف کو دبئی بھیج دیا کرتا تھا اور اس خدمت کے عوض عرب امارات کے امراء سے با قاعدہ ماہانہ تنخواہ لیتا تھا۔

طوائف اور فلمی شاعر

فلمی شاعر خواجہ پرویز کا تعلق چونکہ گلوکاراؤں اور موسیقاروں سے رہا لہٰذا وہ اکثر اوقات ان کا گانا سننے ہیرا منڈی چلے جاتے تھے۔ پھر انہوں نے کسی گائیکہ کے ہاں مستقل ڈیرا بھی لگا لیا تھا۔ خواجہ صاب رات کو اس طوائف کے ہاں شب بسری کرتے اور صبح سویرے باہر آ جاتے اور گھر کی راہ لیتے۔ ایک بار وہ صبح سویرے چوک سے گزر رہے تھے کہ انہیں دو کنجر مسواک کرتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے خواجہ صاحب کو دیکھا اور سلام کیا اس کے بعد آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ کنجروں میں سے یہ لڑکا لائق نکلا ہے صبح سویرے کام پر جاتا ہے اور رات گئے واپس آتا ہے۔ خواجہ صاحب نے ایک مختصر سے مضمون میں اپنے تجربات اور رنڈیوں کے بارے میں کچھ بتایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ طوائفوں کی تین اقسام ہوتی ہیں پہلے نمبر پر خاندانی کنجر ہوتے ہیں وہ کئی پشتوں سے گانے بجانے اور رقص کے فن کو فروخت کر رہے ہیں۔ دوسرے نمبر پر پیرنیاں ہیں جنہیں گھٹیا سمجھا جاتا ہے۔ وہ جسم فروش ہیں ویسے بھارت میں کال گرلز کو اب سیکس ورکرز کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ خاندانی کنجر تو پیرنیوں کو قریب بھی بھٹکنے نہیں دیتے۔ تیسرے درجے کی طوائف کو نوچی کہا جاتا ہے۔ یہ غریب گھرانوں کی نوجوان لڑکیاں ہوتی ہیں جنہیں کنجر گلوکاری کی تربیت دلا کر اپنے ڈیرے کی مستقل فن کار بنا لیتے ہیں۔ کنجر خاندان کی جائیدادوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا یہ صرف روٹی کپڑے اور میک اپ کے خرچہ پر جسم اور فن فروخت کرتی ہیں۔ اب تو خیر پیشہ ور تماش بین نہیں رہے لیکن تماش بینوں کو

بھی کچھ اصول ہوتے تھے وہ گھٹیا درجے کے پیرنی یا نوچی سے تعلق رکھنا بُرا سمجھتے تھے۔

جب کوئی طوائف اپنے کسی عاشق کے ساتھ بھاگ جاتی ہے تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ کنجروں کے گھروں میں صف ماتم بچھ جاتی ہے ایک ایسے ہی کنجر کی لڑکی جب عاشق کے ساتھ بھاگ گئی تو وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ رب عزت کی روٹی دے رہا تھا ان شریفوں کا خانہ خراب ہورات زمرد یا حمیرا کو ورغلا کر لے گیا۔

حمیرا سے یاد آیا حمیرا ہیرا منڈی کی ایک طوائف تھی لیکن کچھ عرصہ کے لیے سمن آباد میں جا بسی تھی تا کہ ڈراموں اور ٹی وی میں شرافت کا لبادہ اوڑھ کر کام لے سکے۔ اس نے الحمرا آرٹس کونسل میں دوسرا ڈرامہ میرا ہی کیا تھا اور میں نے اسے اس ڈھنگ کا کردار دیا تھا جس سے وہ فن کی دنیا میں شہرت حاصل کر گئی تھی۔ اس نے ٹی وی کے ڈرامے کنڈی میں بھی کام کیا تھا اور کئی ایک دوسرے ڈرامے بھی کئے تھے۔ 1973ء میں وہ دوبارہ ہیرا منڈی میں آ گئی تھی۔

ان دنوں مساوات کا دفتر داتا دربار مارکیٹ ہوتا تھا جہاں سے تقریباً روزانہ ہی ہیرا منڈی اس کے پاس چلا جاتا تھا۔ وہ مجھے کئی بار کہہ چکی تھی زاہد صاحب میری خواہش ہے کہ میرے ہاں بچہ ہو اور میں اسے پالوں لیکن میں چونکہ بیوقوف آدمی ہوں اس لیے اس کو بات کو سمجھ نہیں سکا تھا اور پھر ہمارے سر پر تو انقلاب کا بھوت سوار تھا۔ آخر تنگ آ کر اس نے ٹی وی اداکار عابد علی کے ساتھ راہ رسم بڑھائے اور اس کے ساتھ کوئٹہ بھاگ گئی۔ حمیرا کا ماموں روتا ہوا میرے پاس آیا کہ عکاسی صاحب حمیرا تو بھاگ گئی اب ہم کیا کریں گے کیسے گزارا ہوگا؟ کم از کم وہ آپ کو ہی بتا دیتی کہ میں جا رہی ہوں ہم نکاح کر کے اسے یہیں رکھ لیتے۔ بہرطور چھ ماہ یا سال بعد وہ واپس آ گئی پھر وہ آرام سے زندگی شوہر کے ساتھ بسر کرنے لگی۔ اب اس کی بیٹیوں میں سے ایک بیٹی ایمان علی نے ماڈلنگ اور ٹی وی کی دنیا میں دھوم مچائی ہوئی ہے اور ماں سے بڑھ کر فن کارہ ہے۔ جبکہ عابد علی نے اُسے طلاق دے کر کسی اور لڑکی سے شادی کر لی ہے۔

میرے ایک واقف چوہدری صاحب کی بیٹیاں جوان ہوئیں تو بڑے خوش ہوئے اور کہنے

لگے میری بیٹیاں بڑی عزت سے کما رہی ہیں دونوں ہی مراد مند ہیں یعنی کہ والدین کا کہا مانتی ہیں۔

ہدایت کار سنگیتا اور کویتا کی والدہ مہتاب بانو نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ جس عورت کی دو جوان بیٹیاں فن کار ہوں اور ان کی شہرت بھی ہو تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ آپ اگر کسی طوائف زادی کو عقل کی بات بتائیں گے یا کسی اور کام کا کہیں گے تو وہ روک دیں گے کہ ہماری بیٹی کو خراب مت کرو ہم نے بڑی مشکل سے اسے گانا سکھایا ہے، رقص کی تربیت دلائی ہے۔ کنجرا اپنی بیٹی کا سودا آپ سے کبھی نہیں کریں گے اس کے لیے آپ کو خود محنت کرنا پڑے گی کیونکہ کنجروں کا یہ تکیہ کلام عام ہے کہ ہم کنجر ہیں بے غیرت یا دلال نہیں ہیں۔ طوائف کو قابو رکھنے کے لیے ان کے ساتھ بھانجوں وغیرہ کی محبت بڑھائی جاتی ہے۔ وہ تماش بین کو لوٹ کر ان کے لیے کھلونے، کپڑے وغیرہ ضرور خریدتی ہے اس کا مقصد ہوتا ہے کہ وہ کسی تماش بین سے محبت نہ کر سکے بلکہ رشتہ داروں کے چکروں میں ہی رہے۔

ماضی کی مشہور اداکارہ نجمہ نے جب سندھ کے ایک وڈیرے مصطفیٰ جونیجو سے محبت کی اور دونوں نے شادی کرنے کی ٹھانی تو ان دونوں کے آڑے نجمہ کی والدہ آ گئی۔ نجمہ ایک سلجھی ہوئی خاتون تھی اور میں نے جب تک وہ فلم انڈسٹری میں رہی اس کا نہ تو کوئی سکینڈل دیکھا اور نہ ہی سنا۔ بس جب اس نے مصطفیٰ جونیجو کو دل دیا تو ہمیشہ کے لیے اس کی ہو کر رہ گئی۔ شادی کے بعد دنوں میاں بیوی نے گارڈن ٹاؤن والی کوٹھی میں میری دعوت کی تو شوہر نے مجھے بتایا کہ نجمہ کو حاصل کرنے کے لیے اسے 12 لاکھ روپے دینا پڑے ہیں کیونکہ اس کی ماں اس کا پیچھا چھوڑنے پر کسی طور تیار نہیں تھی۔ جبکہ عشرت چوہدری، زمرد اور بابرہ شریف نے اداکار شاہد کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اس سے شادی کر لی تھی اور پھر جس ترتیب سے اس نے شادیاں کی تھیں اسی ترتیب سے طلاقیں بھی دے دیں۔

✿

طوائف اور منٹو

سعادت حسن منٹو ایک ایسا رائٹر تھا جس نے طوائفوں کی زندگی کو قریب سے دیکھا تھا۔ اس نے طوائفوں کے درد کو محسوس کیا اور طوائفوں پر لاتعداد افسانے لکھے۔ کالی شلوار اور مولوی اور زہرہ بائی کے علاوہ اور بھی اس کے مشہور افسانے ہیں۔ زہرہ بائی نے معاشرے کے ٹھیکیداروں پر جو طنز کیا ہے وہ حیران کر دینے والا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمایئے'' جیسا کہ رمضان المبارک میں عام طور پر مسجد میں افطاری بھجوانا ثواب تصور کیا جاتا ہے اس طرح ایک طوائف جس کا نام زہرہ بائی تھا۔ اس نے مسجد میں افطاری بھجوائی تاکہ ثواب حاصل کر سکے۔

مسجد کے مولوی نے افطاری لانے والے بچے سے پوچھا بیٹا یہ افطاری کس کے گھر سے آئی ہے؟ بچے نے بتایا کہ زہرہ بائی نے بھیجی ہے۔ مولوی نے لاحول پڑھی اور بچے کو ڈانٹ کر بھگا دیا کہ اس حرام کی کمائی سے کیا روزہ دار افطاری کریں گے؟ تھوڑی دیر بعد زہرہ بائی خود آ گئی اور بولی'' مولی صاحب آپ نے میرے خون پسینے کی کمائی کو حرام کی کمائی کیسے کہہ دیا۔'' مولوی صاحب نے طنز کرتے ہوئے کہا واہ یہ خوب کہا تم نے خون پسینے کی کمائی۔ طوائف بولی '' جی ہاں اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو میری طرح کسی تماش بین کے ساتھ ایک رات گزار کر دکھائیں آپ کو لگ پتہ جائے گا کہ محنت کی کمائی کیا ہوتی ہے؟ آپ کا واسطہ تو صرف شرفا سے پڑتا ہے۔ آپ کو پتہ نہیں روزانہ کتنے بھیڑیوں سے میں اپنی بوٹیاں نچواتی ہوں۔ ہر کوئی یہی پوچھتا ہے کہ طوائف کیوں بنی؟ کوئی کہتا ہے ناچ دکھاؤ۔ کوئی کہتا ہے انگ انگ ناپ کے

دکھاؤ۔ ہر کوئی کہتا ہے شرافت کی زندگی کیوں نہیں گزارتیں؟ ایسا بھی کر کے دیکھا ہے ایک چاہنے والے سے شادی بھی کی تھی مگر نقصان کے سوا کچھ نہ ملا کیونکہ شادی سے پہلے جو کام کرتی تھی شادی کے بعد بھی وہی کام کرنے پڑے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شادی سے پہلے اس کام کے پیسے ملتے تھے اور شادی کے بعد وہی سارے کام مفتے میں کرنے پڑے۔''

✿

ٹیلی ویژن اور بازار حسن

بازار حسن کی اکثر طوائفیں جو علامہ اقبال ٹاؤن یا پوش علاقوں میں رہائش پذیر رہی ہیں اب فلم اور ٹی وی دونوں میں اپنے فن سے ناظرین کو خوش کر رہی ہیں۔ ہمارے دوست اور سینئر صحافی جمیل قریشی نے اس سلسلہ میں جو انکشافات کیے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

پاکستان کی فلمی صنعت اس سلسلے میں بہت بدنام ہے کہ یہاں پر کام کرنے والی پچانوے فیصد اداکارائیں بازار حسن سے تعلق رکھتی ہیں۔ عام تاثر یہی ہے کہ کسی بھی فلمساز یا ہدایتکار کو جب اپنی فلم کے لیے ہیروئن یا سائڈ ہیروئن کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ سیدھا بازار حسن کا رخ کرتا ہے۔ گویا بازار حسن کو ایک ایسی اکیڈمی کا درجہ حاصل ہے جہاں سے فلمی صنعت کو اپنی ضرورت کے مطابق خام مال دستیاب ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اچھے گھرانوں کی تعلیم یافتہ لڑکیاں جنہیں فن اداکاری یا فن گلوکاری سے دلچسپی ہوتی ہے وہ اپنا شوق ٹیلی ویژن پر پورا کر لیتی ہیں اور یوں ایک ایسا ٹیلنٹ ابھر کر سامنے آتا ہے جو معاشرتی مجبوریوں کی بنا پر شوبز کا رخ نہیں کر سکتا۔ پاکستان میں ٹیلی ویژن کے قیام کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ٹی وی سینٹروں کو فلم سٹوڈیوز نہیں بننے دیا جائے گا اور بازار حسن کی عورتوں کو شامل نہ کیا جائے گا۔ لیکن بعد ازاں یہ اندازہ ہوا کہ جس طرح فلمی دنیا کا بازار حسن کے بغیر گزارہ نہیں اسی طرح پاکستان ٹیلی ویژن بھی ہر قدم پر بازار حسن کا محتاج ہے۔ اس وقت پی ٹی وی کے پانچ سنٹرز کراچی، کوئٹہ، لاہور، پشاور اور اسلام آباد کام کر رہے ہیں۔ ان سنٹروں میں لاہور سنٹر پر

بازار حسن کی مکمل اجارہ داری ہے۔ لاہور ٹی وی سینٹر بازار حسن کو متعارف کروانے والی فنکارائیں پی ٹی وی کے باقی چار سینٹروں کے پروگراموں میں بھی حصہ لیتی ہیں اور یوں پورا پی ٹی وی بازار حسن کی زد میں ہے۔ بازار حسن کی کئی ایک نامور فنکارائیں پی ٹی وی کی اشد ترین ضرورت بن چکی ہیں اور یہ نامور فنکارائیں چونکہ لاہور کے جدید ترین علاقوں میں بڑی بڑی کوٹھیوں میں قیام پذیر ہیں اس لیے ان پر یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ ان کا کسی انداز سے بھی تعلق اس بازار سے ہے یا کسی دور میں رہا ہے۔

رقاصائیں

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے دوران طوائفیں ہیرا منڈی کے علاوہ لاہور کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں رقص کیا کرتی تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد مال روڈ پر سٹینڈرڈ ہوٹل، میٹرو ہوٹل اور نیڈو وغیرہ میں رقص ہوتے تھے۔

سلطانہ پشوری:

ایک ایسی ہی طوائف 1957ء کے لگ بھگ سٹینڈرڈ ہوٹل میں کیبرے ڈانس کرتی تھی۔ وہ پٹھان عورت تھی اور اس کا نام سلطانہ پشوری تھا۔ سلطانہ پشوری پر کئی ایک نوجوان عاشق تھے جن کے درمیان ٹھن گئی تھی اور اس رقاصہ کی خاطر قتل بھی ہوئے تھے۔ یہ طوائف اس قدر خوبصورت تھی کہ لوگوں نے اسے ہالی ووڈ کی مشہور اداکارہ ریٹا ہورتھ کا نام دے رکھا تھا۔

سلطانہ پشوری سے میری ملاقات میرے ایک فلمساز دوست سلامت خان نے کروائی تھی۔ وہ ان دنوں اونچا چیت رام روڈ کے ایک بالا خانے پر رہا کرتی تھی۔ سلامت خان ایک ڈرامہ سٹیج کرنا چاہتے تھے اور انہوں نے اس ڈرامے میں سلطانہ پشوری کی بیٹی گل رعنا کو بطور ہیروئن کاسٹ کر لیا تھا۔ اس ڈرامے کی ہدایات چونکہ میرے سپرد تھیں لہٰذا وہ مجھے اس کے گھر واقع ہیرا منڈی لے گئے تھے۔ میں نے اس من موہنی اور پرکشش لڑکی کو دیکھا تو اس کی معصوم صورت نے مجھے مجبور کیا کہ میں اسے مکالموں کی ادائیگی اور فٹ ورک بتاؤں۔ میں چند روز

تک اسے مکالمے یاد کرانے جاتا رہا یہ کوئی 1974ء کی بات ہے۔ایک روز سلطانہ پشوری کہنے لگی کہ اس کی بیٹی کو فلم میں کاسٹ کرا دیا جائے۔ میں نے اپنے ایک فلمساز دوست میاں اسلم جس کا بہت بڑا ادارہ پاک لینڈ پکچرز کے نام سے کام کر رہا تھا اور لاتعداد فلمیں سر دھڑ دی بازی، تلاش، انتخاب، پاکیزہ، دبئی چلو ریلیز کر چکا تھا وہاں آنے کی دعوت دی۔ان دنوں سلطانہ کی بیٹی نویں کلاس کی طالبہ تھی اور ایک کانونٹ سکول میں پڑھ رہی تھی۔ سلطانہ اپنی بیٹی گل رعنا کو لے کر پاک لینڈ پکچرز واقع رائل پارک آ گئی۔ادارے کے مالک میاں اسلم نے اسی لڑکی کو دیکھا تو کہا یوں لگتا ہے جیسے بچی ابھی ابھی گھر میں سکول کا بستہ رکھ کر آئی ہے۔ماں نے کہا یہ نویں میں پڑھتی ہے میاں اسلم نے تلقین کی کہ بچی نویں جماعت کی طالبہ ہے اسے میٹرک کر لینے دو اور میٹرک کے بعد اسے لے آنا تو اس کو ضرور ہیروئن لے لیں گے۔ان دنوں میاں اسلم کی فلمیں ہدایت کار پرویز ملک ڈائریکٹ کیا کرتے تھے جو کیلی فورنیا یونیورسٹی امریکہ سے ڈائریکشن میں ڈگری لے کے آئے تھے۔

سلطانہ پشوری نے بات سنی اور اچھا کہہ کر دفتر کی سیڑھیاں اتر گئی۔وہیں سے اس نے رکشا لیا اور لڑکی کو لے کر سیدھی ایورنیو سٹوڈیوز میں واقع رنگیلا کے دفتر چلی گئی۔رنگیلا پروڈکشن کا دفتر ان دنوں ایورنیو سٹوڈیوز کے گیٹ کے اوپر کمروں میں ہوتا تھا۔وہاں اداکاری کی شوقین اکثر لڑکیاں آ جایا کرتی تھیں۔ وہیں میری ملاقات ایک رقاصہ پروین سے ہوئی تھی جو ہیرا منڈی میں نوگزے کی قبر کے قریب ہی رہتی تھی۔ میں نے اس کا نام سن کر اسے ایک نیا نام پروین بوبی دے دیا تھا کیونکہ ان دنوں انڈیا کی پروین بوبی کافی مشہور تھی یوں اس نام سے پاکستانی پروین بوبی بھی کافی مشہور ہو گئی تھی اور اسے کئی ایک فلمیں بھی مل گئی تھیں۔

سلطانہ پشوری گل رعنا کو لے کر رنگیلا کے پاس پہنچی اور کہا خان صاحب میں بھی پشاور کی رہنے والی ہوں خدا کے لیے میری بیٹی کو ہیروئن بنا دیجئے۔رنگیلا نے پندرہ برس کی اس لڑکی کو

دیکھا تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔اس نے فوراً ہی حامی بھری اور ایک نئی فلم بنانے کا اعلان کر دیا۔اس فلم کا نام ''صبح کا تارا'' رکھا گیا اور گل رعنا کا نام تبدیل کر کے کنول رکھ دیا گیا۔فلم کی شوٹنگ زور و شور سے شروع ہوئی۔ رنگیلے نے گل رعنا کو پہلے رکھیل کے طور پر رکھا تو نہ جانے رنگیلا کو لڑکی کی کونسی بات پسند آئی کہ پھر اس نے اس لڑکی سے باقاعدہ نکاح کر کے بیوی بنا لیا۔ شاہ نور سٹوڈیوز کے سامنے گلی میں اس کو مکان تعمیر کر کے دیا اور پھر وہ مستقل اس کے بچوں کی ماں بن گئی۔ بیوی بناتے ہی رنگیلا نے فلم سے اس کا تمام کام کاٹ دیا اور اسے گھر کی چار دیواری میں محفوظ کر دیا گیا۔صبح کا تارا کے لیے سنگیتا کو ہیروئن کے طور پر کاسٹ کیا گیا۔ادھر سلطانہ پشوری مایوس ہو گئی تو اس نے اپنے بھائی کی بیٹی انیلہ کو سونیا کے نام سے متعارف کرایا جو کئی ایک فلموں میں ہیروئن آئی بعد ازاں ناروے سے آئے ہوئے ایک پروڈیوسر سے شادی کر کے وہاں چلی گئی۔اس نے اس سے قبل ایک ہیرو بابر سے بھی شادی کی تھی لیکن وہ فلاپ ہو گیا تھا اور اس کے بعد کسی فلم میں نظر نہیں آیا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سلطان پشوری اونچا چیت رام روڈ پر رہتی تھی اس کی ایک اور بیٹی سائرہ بھی بعد میں جوان ہو گئی تھی لیکن اسے وہ فلموں کی طرف لے کر نہیں آئی۔اس کا کہنا ہے کہ اس کا گانے سننے اور رقص دیکھنے بڑے بڑے لوگ آیا کرتے تھے حبیب جالب اور قتیل شفائی جیسے شاعر بھی۔قتیل شفائی کی تو بہت سی طوائفیں ممنون احسان تھیں کیونکہ قتیل اگر ایک طرف فلموں میں گیت لکھتے تھے تو دوسری طرف طوائفیں نہ صرف ان کے گیت گاتی تھیں بلکہ ان کی غزلیں بھی انہیں یاد تھیں۔ان دنوں طوائفوں کا ایک معیار ہوتا تھا وہ بڑے بڑے شعراء کو فرمائشیں کر کے اپنے کوٹھوں پر بلاتیں اور ان سے نئی غزلوں یا گیتوں کی فرمائشیں کرتیں۔قتیل شفائی نے تو ہیرا منڈی کے بارے میں ایک مختصر سی نظم بھی لکھی تھی۔وہ اس طرح کہ ہیرا منڈی کی ہر طوائف اپنی ماں کو امی کی بجائے باجی یا آپا ہی کہتی ہیں۔ایسا ایکٹرسوں میں بھی ہوتا آیا ہے کہ تماشائی انہیں کم عمر کا ہی سمجھیں۔الحمرا آرٹس کونسل میں ہماری ایک

دوست عطیہ شرف ہوتی تھی اس کی اپنی بیٹی بھی تھی لیکن وہ ہمیشہ اسے اپنی چھوٹی بہن ہی ظاہر کرتی تھی۔ جب اس نے خیام سرحدی سے شادی کر لی تو اس نے سمجھایا کہ بیٹی کو چھوٹی بہن مت کہو۔ بیٹی کہنے میں کوئی ہرج نہیں ہے اس پر اس نے بیٹی کو بیٹی کہنا شروع کیا تھا۔

ہاں تو قتیل شفائی نے جو نظم لکھی تھی وہ اس طرح تھی:

میں نے اس سے پوچھا تم اپنی امی کو باجی باجی کیوں کہتی ہو؟
اس نے کہا باجی بھی تو اپنی ماں کو آپا آپا کہتی ہیں!
میں نے سوچا اس بستی کی ہر چیز نرالی ہے
یہاں ماں کو ماں کہنا اک ننگی گالی ہے!

پھر ساحر، احمد ریاض، شورش کاشمیری اور نہ جانے کن کن شعراء نے طوائفوں اور چکلوں پر نظمیں لکھی ہیں۔

سلطانہ پشوری کو بھی بیٹیاں باجی ہی کہتی تھیں۔ سلطانہ پشوری جب سٹینڈرڈ ہوٹل میں کیبرے رقص کرتی تھی تو وہاں اور لڑکیاں بھی ڈانسر ہوتی تھیں ان میں ایک انجلا بھی تھی۔ انجلا کے بعد سلطانہ پشوری نے ڈانس شروع کیا تھا۔ سلطانہ پشوری نے بتایا تھا کہ انجلا ایک خوبصورت لڑکی تھی اس کی صراحی دار گردن سے پانی پیتے ہوئے نظر آتا تھا۔ وہ برف کی طرح تھی اتنی خوبصورت کہ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اس کو میں نے پشاور میں دیکھا تھا اس کی ماں ایرانی تھی اور باپ انگریز تھا۔ ڈانس کرتے ہوئے اکثر لوگ ہم دونوں کو بہنیں ہی سمجھتے تھے۔ اس وقت میری عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ انجلا کی ایک نوکرانی تھی جو میرے گھر بھی آتی تھی وہ پہلے کرسچین تھی پھر مسلمان ہوگئی۔ اس زمانے میں وہ مدراس (چنائی) بھارت میں نرسنگ کے شعبہ سے وابستہ تھی۔ اس کے والدین زمیندار قسم کے لوگ تھے۔ اچھے بھلے، وہاں ایک پٹھان گیا۔ اس کے ساتھ اس کا عشق ہوگیا۔ اس سے ایک بچہ ہوا۔ وہ اسے لاہور لے آیا اور

اسٹیشن پر چھوڑ کر غائب ہوگیا۔ یہ کسی اور کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس نے اس سے نکاح کر لیا۔ وہ اذیت پسند شخص تھا مارتا تھا۔ پھر اس سے چھٹکارا حاصل کیا تو میرے پاس آ گئی۔ اس کے پاس ایک بچی بھی تھی جسے راولپنڈی میں کسی نرس کے پاس چھوڑ آئی اور پھر اسے ملنے نہیں گئی۔ اب تو اس کے دو اور بچے جوان ہو گئے ہیں وہ اس کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔

ہمارے محلے میں ایک دلشاد تھی اس نے پٹھان سے شادی کر لی وہ اسے پشاور لے کر گیا لیکن پٹھان کے گھر والوں نے قبول نہیں کیا۔ اس کا حقہ پانی بند کر دیا۔ اس کے ہاں ایک لڑکی ہوئی وہ رکھ لی اور اسے دھکے مار کر نکال دیا۔ یہ پھر ہیرا منڈی بیٹھ گئی۔ اس کی بیٹی بڑی ہوئی تو ماں کے پیچھے آ گئی اس کا نام فردوس تھا۔ اس کے ہاں ایک عربی سے فریدہ پیدا ہوئی۔ دلشاد اب پرنانی ہو چکی ہے اور کراچی میں رہتی ہے۔ اس طرح ثریا وڑائچ بھی ٹھسے دار عورت تھی اس کے ساتھ ایک آدمی شفیع وڑائچ رہتا تھا ہر وقت نشے میں اسے گالیاں بھی دیتا تھا ان کے پاس ایک زرینہ تھی وہ بھی سٹینڈرڈ ہوٹل میں ڈانس کرتی تھی۔

عذرا روحی بھی ایک طوائف تھی بڑی مشہور بھی ہوئی اس نے صبیحہ ایکٹرس کے باپ سے شادی کر لی تھی۔ اس نے صبیحہ خانم کی سونے کی چوڑیاں چوری کر لیں جس پر محمد علی ماہیا نے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ پھر ہیرا منڈی میں آ گئی۔ اس کی ایک بیٹی صبا ہے جو پشتو فلموں میں کام کرتی ہے۔ ایم اکرم جو کہ فلموں کے ہدایت کار ہیں اس کی بہن ساحرہ تھی جو ہیروئن کیس میں اندر ہو گئی تھی۔ اس کی بیٹی صبا تھی جس کی شادی ایک فلمساز ارشد وڑائچ سے ہو گئی تھی اب تو بوڑھی ہو چکی ہے۔ یہ جو نرگس سٹیج اور فلموں میں کام کرتی ہے اس کی ماں بلو ہمارے پیچھے رہتی تھی۔ پھر نرگس نے بیوٹی پارلر کھول لیا اس کی بہن دیدار بھی تھیٹر میں کام کرنے لگی۔ نرگس نے کروڑوں کمائے اور اپنے باپ کو سیٹ کر دیا اس کا ایک ریکارڈنگ سٹوڈیو ہے۔ بھائی بھی سیٹ ہو گیا ہے۔ یہ فیملی بڑی کامیاب رہی ہے۔

پنا بیگم:

اسی طرح پنا بیگم نے ہدایت کار سلیمان سے شادی کر لی تھی اور وہ زرین سلیمان ہوگئی تھی اولاد جوان ہوئی تو اس نے سلیمان سے طلاق لے لی۔ وہ پھر پنا بیگم کے روپ میں آ گئی اور شاکر علی میوزیم میں ایک ڈانس اکیڈمی کھول لی۔ دسویں عالمی پنجابی کانگرس جو 2004ء میں 27 مئی سے 30 مئی تک چنڈی گڑھ بھارتی پنجاب میں ہوئی وہاں منعقد ہونے والے ثقافتی پروگراموں میں 25 سال بعد 60 سال کی عمر میں ٹینا ثانی کی گائی ہوئی فیض احمد فیض کی غزل پر کلاسیکل رقص پیش کیا۔ پنا میں جوانی والا ہی دم خم تھا اور اس کا جسم بھی دبلا پتلا اور اسی طرح پھر تیلا تھا۔ جبکہ نوجوان گلوکارہ روزینہ کوثر نے نور جہاں اور سریندر کور کے گیتوں سے سکھوں اور سکھنیوں کے دل جیت لئے تھے۔

عشرت چوہدری:

عشرت چوہدری بھی ڈانسر تھی لیکن اتنی اچھی نہیں۔ عشرت چوہدری کے ہاں پیپلز پارٹی کے دور میں قومی اسمبلی کے ممبر حامد یاسین آیا کرتے تھے۔ حامد یاسین نے عشرت کو لاکھوں روپے کھلائے۔ جب پارٹی کی حکومت آئی تو حامد یاسین، شمیم احمد خان (سابق ڈپٹی سپیکر)، مزمل شاہ وغیرہ نے اپر مال پر واقع انٹرنیشنل ہوٹل میں ڈیرا لگالیا۔ عشرت چوہدری وہاں اس سے ملنے جاتی تھی۔ ایک بار حامد یاسین، رمضان پرواز اور مساوات کا ایک فوٹو گرافر طاہر اور دیگر لوگ ہیرامنڈی میں عشرت چوہدری کا مجرا سن رہے تھے کہ چھاپہ پڑ گیا۔ دراصل عشرت چوہدری کے گھر سے کسی نے اطلاع دی تھی کہ شراب پی کر یہ لوگ غل غپاڑہ کر رہے ہیں اور تنگ کر رہے ہیں۔ اس پر ٹبی تھانہ کے ایس ایچ او نے چھاپہ مارا۔ چونکہ ہیرا منڈی میں پولیس طوائفوں کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے تاکہ کوئی تماش بین شراب پی کر بہکے تو اس کو پکڑ لیں اور پیسے کھرے کر لیں۔ چھاپہ پڑا تو طاہر نے عشرت چوہدری سے منت کی کہ باجی مجھے بچاؤ۔ باجی

نے اسے کہا کہ پینٹ سے قمیص باہر نکال لو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ پولیس پکڑنے لگی تو عشرت نے کہا کہ اسے کیوں پکڑتے ہو یہ تو ہار بیچنے والا لڑکا ہے۔ جبکہ پولیس حامد یاسین (چیف وہپ) اور رمضان پرواز اور دیگر کو پکڑ کر تھانے لے گئے۔ تھانے لے جا کر پولیس نے بجلی بند کر دی اور جتنے پارٹی کے ورکر پکڑے گئے تھے ان کی خوب مرمت کی اور کپڑے وغیرہ پھاڑ دیئے۔ رمضان پرواز نشے میں دھت دیوار سے ٹیک لگائے یہ بار بار کہہ رہے تھے کہ پیپلز پارٹی کے ساتھ بڑی سازش ہوئی ہے۔ ہم انقلاب لائل پور سے لے کر چلے تھے پولیس نے ٹبی تھانے میں روک لیا۔ اسی دوران کسی نے افتخار تاری جو کہ ان دنوں صوبائی وزیر تھے کو اطلاع کر دی۔ وہ اپنے حواریوں کو لے کر تھانے پہنچے خوب لڑائی ہوئی۔ ادھر مساوات کے دفتر میں اس کے نیوز ایڈیٹر عباس اطہر کو پتہ چلا تو اس نے صفحہ اول پر تھانے کیخلاف خبر لگا دی۔ صبح گورنر نے پڑھا ان دنوں گورنر مصطفیٰ کھر ہوتے تھے۔ انہوں نے ڈی آئی جی سے بات کی اور پھر پورا تھانہ معطل ہو کر لائن حاضر ہو گیا۔ حامد یاسین اور رمضان پرواز کے علاوہ افتخار تاری کی پھٹے ہوئے کپڑوں میں تصاویر ایک عرصہ تک میرے دراز میں رہیں پھر گم ہو گئیں نہ جانے کون لے گیا۔

ایک زمانہ تھا کہ فلم انڈسٹری میں طوائفیں کام کرتی تھیں ان کا ایک معیار ہوتا تھا کسی ایک کی داشتہ بن کر رہتی تھیں اور کسی سے تعلق نہیں رکھتی تھیں نہ ہی وہ عام محفلوں میں جاتی تھیں ایک فاصلہ تھا جو پبلک اور فن کار کے درمیان ہوتا تھا لیکن جب سے فلم انڈسٹری میں کال گرلز نے ڈیرا جمایا ہے وہ فن کی بجائے سب سے پہلے پجارو اور موبائل فون کی سوچتی ہیں اسی بنا پر روزانہ کسی نہ کسی کا بستر گرم کرنا ان کا شیوہ بن جاتا ہے۔ ایسی لڑکیاں مختلف اڈوں سے فلموں میں آتی ہیں۔ ایک ایسا ہی اڈہ نگینہ خانم کا بھی تھا جہاں سے میرا، لیلیٰ، ثناء، صائمہ، نیلی، فرزانہ تھہیم، شہزادی، سپنا اور نہ جانے پشتو فلموں کی کون کون سی لڑکیاں آئیں۔ نگینہ خانم کون تھی کہاں گئی کیسے قتل ہوئی اس کی تفصیل مختلف واقعات والے باب میں درج کی جائیں گی۔

❁

گلوکارائیں

ڈرامے کی نسبت موسیقی کے پروگراموں میں اس بازار کی فنکارائیں کا غلبہ زیادہ ہے۔ بازارِ حسن کی گلوکاراؤں کی کثیر تعداد کو ٹی وی کے موسیقی کے پروگراموں میں دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پی ٹی وی کے کار پردازان بھی فلمی صنعت کے افراد کی طرح ٹیلنٹ لے کر اس پر محنت کرنے کے بجائے تیار شدہ مال کے خریدار ہیں۔ بازارِ حسن میں چونکہ لڑکیوں کو بچپن ہی سے موسیقی کی تربیت دی جاتی ہے اس لیے وہ بڑی ہو کر سر تال سے اچھی طرح واقف ہو جاتی ہیں۔ ٹیلی ویژن والوں کو ایسی لڑکیوں پر محنت نہیں کرنی پڑتی۔ کچھ گلوکارائیں ہیں جنہوں نے اس بازار میں گانے کی تربیت حاصل کرنے کے بعد ریڈیو پر آ کر میچورٹی حاصل کی اور یوں پی ٹی وی کو تیار شدہ مال دستیاب ہو گیا تو آیئے ذرا جائزہ لیتے ہیں کہ پی ٹی وی کے قیام سے اب تک کتنی فنکارائیں بازارِ حسن سے وارد ہوئیں۔ آغاز سینئر گلوکاراؤں سے کرتے ہیں۔

ملکہ ترنم نور جہاں:

پنجاب کے معروف شہر قصور سے تعلق رکھتی تھی۔ صوفی شاعر بلھے شاہ کے اس شہر میں بڑا قدیم ایک بازار ''محلّہ'' ہے جہاں ملکہ ترنم نور جہاں کے آباؤ اجداد کے گھر آج بھی موجود ہیں۔ ان کے دیگر رشتے دار قصور میں ہی آباد ہیں۔ ملکہ ترنم نور جہاں کا پیدائشی نام اللہ وسائی ہے۔ نامی گرامی استادوں سے رقص و موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ گلوکاری میں موسیقار استاد غلام محمد ان کے استاد ہیں۔ بہت چھوٹی عمر میں ہی قصور کو چھوڑ کر ممبئی چلی گئی تھیں اور فلموں میں بطور

بے بی نور جہاں کام شروع کیا۔ ابھی چائلڈ سٹار ہی تھیں کہ ممبئی میں اپنے دور کے معروف فلمساز ہدایتکار و اداکار سید شوکت حسین رضوی کو پسند آ گئیں۔ شاہ صاحب خود بھی بہت خوبرو وجیہہ گورے چٹے اور دراز قد نوجوان تھے۔ ملکہ ترنم کی عمر اس وقت بمشکل تیرہ یا چودہ سال کی تھی کہ سید شوکت حسین رضوی نے انہیں ''سرپرستی'' میں لے لیا۔ بعد ازاں ان سے نکاح کر لیا۔ شاہ صاحب نے کئی فلمیں بنائیں جس میں ملکہ ترنم نور جہاں نے بطور ہیروئن اداکاری بھی کی اور گلوکاری کا جلوہ بھی دکھایا۔ ایک فلم ''دوست'' میں خود شوکت حسین رضوی نے انکے مقابل ہیرو کا کردار ادا کیا۔ پھر شاہ صاحب نے ایک فلم ''جگنو'' بنائی جس میں ملکہ ترنم نور جہاں کے مقابل دلیپ کمار کو ہیرو لیا۔ اس فلم کے سبھی گانے ملکہ ترنم اور محمد رفیع نے گائے۔ ایک گانا ''یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے'' بے حد ہٹ ہوا۔ پاکستان بننے کے بعد رضوی صاحب بمع اپنی بیگم (ملکہ ترنم) اور بچوں کے بمبئی سے ہجرت کر کے لاہور آ گئے اور اپنا ذاتی فلم سٹوڈیو شاہ نور کے نام سے قائم کیا۔ سٹوڈیو کا نام شاہ صاحب نے اپنے اور ملکہ ترنم نور جہاں کے نام کو ملا کر شاہ نور رکھا۔ پاکستان میں بھی ملکہ ترنم نور جہاں نے شاہ صاحب کی فلموں کے علاوہ دوسرے فلمسازوں کی فلموں میں بطور ہیروئن نہ صرف اداکاری کی بلکہ تمام تر گانے بھی خود گائے۔ بعد ازاں سید شوکت حسین رضوی سے طلاق لینے کے بعد ملکہ ترنم نے اعجاز درانی سے شادی کر لی۔ اعجاز درانی سے شادی کے بعد انہوں نے اگرچہ اداکاری ترک کر دی مگر گلوکاری جاری رکھی جو مرتے دم تک رہی۔ وہ نہ صرف فلم والوں کی بھی ضرورت رہیں بلکہ پاکستان ٹی وی کی ابتداء ہی سے ضرورت رہیں اور موسیقی کے کسی بھی پروگرام میں ان کی شرکت پی ٹی وی کے کار پردازان اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ لاہور ٹی وی سینٹر سے ان کا ایک پروگرام ''ترنم'' سینئر پروڈیوسر فرخ بشیر پوری ایک سہ ماہی تک پیش کرتے رہے۔ بہر کیف ملکہ ترنم نور جہاں ہمارے ملک کا ایک قیمتی سرمایہ تھیں جو آخری عمر تک ٹی وی پر آتی رہیں۔ ستمبر 65 میں گائے ہوئے ان کے ترانے ہمیشہ جاوداں رہیں گے۔

ملکہ پکھراج:

تعلق وہیں سے ہے لیکن سید شبیر حسین شاہ صاحب سے شادی کے بعد وہاں سے تعلق ختم کرلیا۔ اپنے دور کی بے حد مقبول گلوکارہ تھیں۔ ریڈیو پاکستان سے اپنی آواز کا جادو جگایا۔ قیام پاکستان سے قبل آل انڈیا ریڈیو سے گاتی رہیں۔ سید صاحب سے رشتہ ازدواج میں منسلک رہنے کے بعد بھی گلوکاری کا سلسلہ جاری رہا۔ سید صاحب نے ان سے شادی بھی ان کی گلوکاری سے متاثر ہوکر کی تھی۔ ان کی اولاد میں ان کی بیٹی طاہرہ سید نے ان کے فن کو آگے بڑھایااور ماں کی طرح ہی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ ملکہ پکھراج نے پاکستان ٹی وی پر متعدد بار اپنا فن پیش کیا۔ بلکہ کئی پروگراموں میں ملکہ پکھراج اور طاہرہ سید نے ایک ساتھ گائیکی کا جادو بھی جگایا۔ خصوصا ملکہ پکھراج کا ایک پہاڑی گیت (کشمیری گیت) بہت مقبول ہوا۔ مرحومہ ملکہ پکھراج کی رہائش لاہور کی جدید آبادی ماڈل ٹاؤن میں تھی۔

ملکہ پکھراج اپریل 2004 کو اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ وہ بیسویں صدی کی بہترین گلوکارہ تھیں۔ انہوں نے ایک ڈائری میں اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ جموں کشمیر کے ایک گاؤں حمیر پور لدھار میں پیدا ہوئیں جو اکھنور سے نومیل کے فاصلہ پر دریائے چناب کے کنارے آباد ہے۔ ان کی پیدائش بھی ایک معجزے سے کم نہ تھی۔ اس گاؤں میں ایک سادھو بابا روٹی رام رہا کرتا تھا۔ جب انہوں نے پیدا ہونا تھا تو ان کی ماں سخت تکلیف میں تھیں۔ ان کے نانا باباجی کے پاس گئے اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ دعا کیجئے ہمارے ہاں جو بچہ ہو وہ صحیح سلامت رہے۔ باباجی نے ایک پکوڑی میرے نانا کو دی اور کہا کہ جا کر زچہ کو کھلا دو۔ اس پکوڑی کا کھانا تھا کہ ماں کی تکلیف کم ہوگئی اور پھران کا جنم ہوا۔ دایہ نے انہیں ان کے نانا کو پکڑا دیا جو اس وقت انہیں باباجی کے پاس لے گئے۔ وہ ابھی کمرے میں داخل ہی ہوئے تھے کہ باباجی نے کہا "گوبندا مجھے نہیں پتہ کہ یہ بچہ ہے یا بچی لیکن یہ ملکہ معظمہ ہے۔ یہ ایک روز

دلوں پر حکومت کرے گی۔" باباجی جو کہ صرف ڈوگری جانتے تھے انہوں نے نا جانے کیسے اردو کا یہ نام انہیں دیا۔ ان کی نانی ان کا نام پکھراج رکھنا چاہتی تھیں چنانچہ باباجی کا اور نانی کا نام ملا کر ملکہ پکھراج رکھ دیا گیا۔

فریدہ خانم:

بھارتی پنجاب امرتسر سے تعلق ہے فریدہ خانم کی بڑی بہن مختار بیگم اپنے دور کی نامور گلوکارہ تھیں جن سے سٹیج کے معروف ڈرامہ نگار آغا حشر نے شادی کر لی تھی۔ تعلق ان کا اسی خصوص بازار سے ہے۔ فریدہ خانم عرصہ دراز سے لاہور میں مقیم ہیں۔ یہاں نجی محفلوں میں اپنے فن کا جادو جگانے کے بعد ریڈیو پاکستان سے منسلک رہیں اور اپنی بہن مختار بیگم کی طرح غزل گائیکی میں بہت نام کمایا۔ پاکستان میں ٹی وی کے قیام کے بعد وہ ریڈیو کے ساتھ ساتھ ٹی وی کی بھی ضرورت بن گئیں۔ پہلے ان کے مداح صرف ریڈیو ہی سے ان کی مدھر آواز سنتے تھے۔ ٹیلی ویژن کے اجرا کے بعد انہیں ایک خاص ادا کے ساتھ گاتے بھی دیکھا۔ بہر کیف ملکہ ترنم نور جہاں کی طرح بڑی بھرپور زندگی گزاری اور بازار سے ناطہ توڑ کر شہر کے پوش علاقہ سے ناطہ جوڑلیا۔

نذیر بیگم:

اپنے دور کی بہت اچھی گلوکارہ رہی ہیں۔ گائیکی کا حق ورثے میں ملا ہے۔ پہلے ریڈیو پہ فن کا جادو جگاتی تھیں پھر فلموں میں پلے بیک گانے دیئے۔ ان کا ایک پنجابی فلم تیس مار خان کا گایا ہوا گانا "نمبواں دا جوڑا ساں باگے وچوں توڑیا" (لیموں کا جوڑا ہم نے باغ میں سے توڑا) بے پناہ مقبول ہوا اور اسی گانے نے نذیر بیگم کو صحیح معنوں میں شناخت دی۔ ٹیلی ویژن کے قیام کے بعد انہوں نے لاہور ٹی وی سے اپنا فن پیش کیا اور متعدد پروگراموں میں شرکت

کی۔ان کا تعلق ''وہیں'' سے ہے البتہ لاہور کی الحمراء آرٹس کونسل کے ڈپٹی ڈائریکٹر اور اداکار محمد زبیر سے شادی کرنے کے بعد انہوں نے اپنا تعلق وہاں سے توڑ دیا۔ نذیر بیگم نے شادی کے بعد بھی اپنا فن جاری رکھا۔ کئی بار ملک سے باہر بھی گئیں اور اپنی گائیکی سے ملک کا نام روشن کیا۔ خصوصاً روس میں انہیں بہت پذیرائی ملی۔ اب گزشتہ چند سالوں سے نذیر بیگم پی ٹی وی سے دور ہو گئی ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ٹی وی والے انہیں مدعو نہیں کرتے یا وہ خود ہی آنا پسند نہیں کرتیں۔

نسیم بیگم:

جب تک زندہ رہیں خود کو ملکہ ترنم نور جہاں کے متبادل کے طور پر پیش کرتی رہیں۔ ترانے اور آواز میں وہ ملکہ ترنم نور جہاں سے بے پناہ مماثلت رکھتی تھیں۔ ریڈیو کے بعد فلموں میں بھی گانے گائے جو بے حد مقبول ہوئے۔ ان کا گانا سن کر لوگوں کو ہمیشہ ملکہ ترنم نور جہاں کی آواز کا گمان ہوا۔ 1965ء کی جنگ میں ان کا گایا ہوا ایک قومی نغمہ ''اے راہ حق کے شہیدو وفا کی تصویرو۔ تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں'' بے پناہ مقبول ہوا۔ اب بھی جب جنگ ستمبر کی یاد منائی جاتی ہے یہ نغمہ ریڈیو اور ٹی وی سے بار بار نشر کیا جاتا ہے۔ تعلق نسیم بیگم کا بھی اسی بازار سے تھا۔ نسیم بیگم جب تک زندہ رہیں وہ ریڈیو، ٹی وی اور فلم کی ضرورت رہیں۔

ثریا ملتانیکر:

جیسے کہ نام سے ظاہر ہے کہ ان کا تعلق ملتان سے ہے۔ اس میں قطعاً شک نہیں کہ فن موسیقی اور فن اداکاری میں ملتان کی سرزمین بہت زرخیز ہے۔ اس سرزمین سے جتنے فنکار شوبز میں وارد ہوئے ہیں اتنے کسی علاقے یا شہر سے نہیں ہوئے۔ ثریا ملتانیکر کا تعلق ملتان کے مشہور بازار حسن سے ہے جو ملتان کے ''پاک دروازہ'' سے ملحقہ ہے۔ پہلے اپنے ٹھکانے پر اپنے فن کا

مظاہرہ کر کے داد تحسین پاتی تھیں اور پھر ریڈیو اور اس کے بعد ایک فلم میں ایک گانا گایا ''بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے۔ کہیں دل لگانے کی کوشش نہ کرنا''۔ یہ گانا اس قدر مقبول ہوا کہ بچے بچے کی زبان پر آ گیا۔ صرف ایک گانے نے ثریا ملتانیکر کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اسی شہرت سے پاکستان ٹی وی نے فائدہ اٹھایا اور اور لاہور ٹی وی سینٹر سے موسیقی کے ایک پروگرام میں ثریا ملتانیکر نے پہلا گانا یہی گایا۔ بعد ازاں انہیں پی ٹی وی کے متعدد پروگراموں میں مدعو کیا گیا اور وہ خود ٹی وی کے حوالے سے پہچانی گئیں۔ اب کافی عرصے سے ٹی وی سے دور ہیں۔ خیال یہی کیا جاتا ہے کہ اب ان کی آواز میں وہ کھنک باقی نہیں ہے جو پہلے تھی۔ بلکہ ان کی آواز میں کپکپاہٹ کچھ زیادہ آ گئی ہے۔

بلقیس خانم:

براہ راست بازار حسن سے تعلق رکھتی ہیں۔ کافی عرصہ تک بازار حسن میں رقص و سرور کی محفلیں سجاتی رہی ہیں۔ پاکستان ٹی وی لاہور سینٹر کے معروف موسیقار محسن رضا کی حقیقی بہن ہیں۔ اس بازار میں اپنے دفتر میں ٹائم لگانے کے ساتھ چند فلموں میں بھی گانے گاتی رہیں ہیں۔ ٹی وی کے قیام کے بعد انہوں نے لاہور ٹی وی کے موسیقی کے شعبے سے رابطہ قائم کیا اور لاہور ٹی وی سینٹر سے انہوں نے ابتداء کی۔ بعد ازاں بھارت کے کلاسیکل موسیقی کے نامور استاد رئیس خان سے ان کی ملاقات بمبئی میں ہوئی تو دونوں میں چاہت کا رشتہ قائم ہو گیا اور استاد رئیس خان نے پاکستان آ کر ان سے شادی کر لی۔ جن دنوں لاہور ٹی وی کے سابق جنرل منیجر رفیق احمد وڑائچ بطور پروڈیوسر موسیقی کے پروگرام کرتے تھے انہوں نے بلقیس خانم کو بھر پور پروجیکشن دی۔ استاد رئیس خان سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد بلقیس خانم نے بازار حسن کی رہائش ترک کر دی اور ٹی وی پر بھی کم کم آنے لگیں۔ وہ زیادہ عرصہ اپنے شوہر کے پاس بمبئی میں رہیں اور پھر مستقل وہیں منتقل ہو گئیں۔

تصور خانم:

ایک عرصہ تک بازار حسن میں گانے بجانے کا کاروبار کرتی رہیں۔سب سے پہلے ٹی وی کے مقبول سٹیج پروگرام،ضیاء محی الدین شو میں انہیں مدعو کیا گیا۔کراچی ٹی وی سے شروع ہونے والا پروگرام بعدازاں لاہور شفٹ ہوگیا اور لاہور ہی میں تصور خانم کو اس شو میں آنے کا موقع ملا۔(جمیل قریشی) ان دنوں ضیاء محی الدین شو کے سکرپٹ رائٹر اور پروگرام آرگنائزر تھے جب تصور خانم گانے کے لیے سٹیج پر آئیں تو سینکڑوں ناظرین کو دیکھ کر گھبرا گئیں۔(ان دنوں پہلے سے آڈیو کی ریکارڈنگ کا رواج نہیں تھا) خلیل احمد موسیقار تھے۔تصور خانم نے گانا شروع کیا تو انترہ کہتے ہی بے سری ہوگئیں۔دوتین مرتبہ کوشش کی گئی لیکن وہ نہ گا سکیں اور گھبراہٹ کی وجہ سے پسینے میں شرابور سٹیج سے واپس چلی گئیں۔شو کی ریکارڈنگ کے بعد جب سب لوگ ہال سے چلے گئے تو بعد میں اطمینان کے ساتھ انہیں خوب حوصلہ دلا کر ان کا گانا ریکارڈ کیا۔بعد ازاں وہ گاہے گاہے ٹی وی پر آتی رہیں۔گانے کے دوران ان کا اپنی ناک کی نوک سے ہلکی سی جنبش دینا ناظرین کو اس قدر اچھا لگا کہ وہ بار بار انہیں ٹی وی سکرین پر دیکھنے کے خواہش مند ہو گئے۔فلمسٹار رنگیلا کی فلم رنگیلا کا گیت "وے سب توں سوہنیا" سے شہرت حاصل کی۔ٹی وی سے شہرت پانے کے بعد تصور خانم نے سندھ کے ایک وڈیرے سے شادی کرلی اور بازار حسن کو چھوڑ کر اپنے شوہر کے گھر جا بسی۔تصور خانم کے غالباً دو ایک بچے بھی ہیں۔بعدازاں ان کے شوہر کی وفات کے بعد گھر والوں نے انہیں فارغ کردیا اور وہ واپس لاہور آ گئیں۔اب وہ طویل عرصہ سے ٹی وی سکرین سے غائب ہیں۔

شاہدہ پروین:

اپنے دور کی مشہور و معروف کلاسیکل گلوکارہ اور غزل گائیکی کی ماہر زاہدہ پروین کی بیٹی

تھیں۔زاہدہ پروین سالہا سال تک ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ رہیں۔تعلق ان کا بازار حسن سے رہا ہے۔اپنی بیٹی شاہدہ پروین کو انہوں نے ہی گانے کی تربیت دی اور غزل کی گائیکی کا انداز سکھایا۔شاہدہ پروین نے بھی اپنے فن کا آغاز ریڈیو سے کیا اور نجی محفلوں میں گاتی رہیں۔فلموں کی پلے بیک سنگر بننے کی کوشش کی لیکن ان کے ساتھ بھی تصور خانم والا معاملہ پیش آیا۔انہیں ایک فلم کے لیے گیت ریکارڈ کروانے کے لیے باری سٹوڈیو لاہور بلایا گیا۔کافی ریہرسل کے بعد جب ریکارڈنگ کا مرحلہ آیا تو انترے پر پہنچ کر شاہدہ کی آواز اس رینج تک نہ پہنچ سکی۔نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں واپس بھجوا دیا گیا اور وہی گانا دوسری گلوکارہ سے گوایا گیا۔ٹی وی پر سب سے پہلے انہیں اس وقت کے میوزک پروڈیوسر رفیق احمد وڑائچ نے موقع دیا۔ویسے موسیقی کے پروگراموں میں وہ اکثر اپنے فن کا مظاہرہ کرتی رہیں۔انہیں لوک موسیقی کے حوالے سے بہترین گلوکارہ (ریڈیو) کا گریجوایٹ ایوارڈ بھی ملا ہے۔وہ 2002ء میں انتقال کرگئیں۔

ترنم ناز:

تعلق ان کا بھی براہ راست بازار حسن سے ہے۔اگرچہ ان کی رہائش اب ایک جدید آبادی میں ہے لیکن ان کا ذاتی گھر اب بھی بازار حسن میں ہی ہے۔سابق جنرل منیجر رفیق احمد وڑائچ جب بطور سینئر پروڈیوسر موسیقی کے پروگرام کیا کرتے تھے تو انہوں نے لاہور ٹی وی سے ترنم ناز کو متعارف کرایا۔وہ بہت پختہ گلوکارہ ہیں۔کلاسیکی رنگ میں بھی ماہر ہیں آواز بھی بہت کھنک دار ہے۔ان کی آواز کافی حد تک ملکہ ترنم نور جہاں سے مماثلت رکھتی ہے۔اکثر محفلوں میں ملکہ ترنم نور جہاں کے گائے ہوئے مقبول گیت ہی پیش کرتی ہیں۔موسیقی کے پروگراموں کے سینئر پروڈیوسر فرخ بشیر انہیں اکثر اپنے پروگراموں میں پیش کرتے رہتے ہیں۔اگر یہ کہا جائے کہ ان کا شاید ہی کوئی ایسا پروگرام ہوگا جس میں ترنم ناز نے شرکت نہ کی تو غلط نہ ہوگا۔

کافی عرصہ قبل ترنم ناز نے ملکہ ترنم نور جہاں کی شاگردی اختیار کی۔ ملکہ ترنم نے ایک شاندار تقریب میں ترنم ناز کو اپنی شاگردی میں لینے کا اعلان کیا اور ترنم ناز کا منہ میٹھا کرایا جس کے بعد ترنم ناز نے ان کی خدمت میں پچاس ہزار روپے کا نذرانہ پیش کیا۔ انہیں ریڈیو کے حوالے سے ہلکی پھلکی موسیقی کی بہترین گلوکارہ کا گریجوایٹ ایوارڈ بھی ملا۔

ناہید اختر:

ملتان سے تعلق رکھتی ہیں ملتان ریڈیو سے گانے کا آغاز کیا۔ ملتان سے لاہور آ گئیں اور فلموں میں پلے بیک گانا سب سے پہلے موسیقار ایم اشرف نے اپنی فلم کے لیے گوایا۔ فلم سے شہرت ملی تو ٹیلی ویژن والوں نے بھی ان سے استفادہ کیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ناہید اختر نے ٹی وی اور فلم سے یکساں طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ ناہید اختر ٹی وی پر اس وقت آئیں جب بلیک اینڈ وائٹ کا دور تھا۔ وہ چھوٹی عمر کی تھیں بے حد دبلی پتلی۔ ٹی وی کے بچوں کے پروگراموں میں بھی انہوں نے شرکت کی اور گانے گائے۔ ملتان کے بازار حسن سے انکا تعلق ہے۔ فلم اور ٹیلی ویژن کے لیے انہوں نے ان گنت گانے گائے۔ انکے اکثر گانے مقبول عام ہیں۔ لاہور ٹی وی کی تو وہ بہت چہیتی گلوکارہ تھیں۔ فلموں میں بھی ملکہ ترنم نور جہاں کے بعد وہ زیادہ مصروف تھیں۔ ایک سیاسی شخصیت سے شادی کے معاملے میں ان کے والدین سے اختلافات ہو گئے اور انہوں نے احتجاجاً گلوکاری اور ٹی وی پر گانا ترک کر دیا۔ گزشتہ کئی سالوں سے وہ شوبز سے دور ہیں۔ انہوں نے ایک صحافی آصف علی پوتا سے شادی کا اعلان کیا اور اب ان کے بچوں کی ماں ہیں۔

ثریا خانم:

بہاولپور کے بازار حسن سے تعلق رکھتی ہیں۔ اپنی بہن کو فلموں کی اداکارہ بنوانے کے لیے

لاہور آئیں۔ ان کی بہن تو اداکارہ نہ بن سکی البتہ ثریا خانم لاہور ریڈیو کی سنگر ضرور بن گئیں۔ اس سے پہلے وہ بہاولپور اور ملتان ریڈیو سے اپنے فن کا مظاہرہ کرتی رہی تھیں۔ پنجاب کے لوک گیت گانے میں بڑی مہارت رکھتی ہے۔ سرائیکی گانے بھی بڑے خوبصورت انداز میں گاتی ہیں۔ لاہور ٹی وی کے موسیقی کے تقریباً ہر پروگرام میں انہیں شریک کیا جاتا ہے۔ پتہ چلا ہے کہ انہوں نے ریڈیو اور ٹی وی کے لیے ایک اداکار سے شادی کر لی لیکن انہوں نے بعد میں اس کی تردید کر دی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے کافی بیمار رہی ہیں۔ جب بہاولپور سے لاہور آئی تھیں تو بہت دبلی پتلی اور سمارٹ تھیں لیکن لاہور کی آب وہوا نے فربہ کر دیا ہے اور یہ موٹاپا ہی ان کی بیماری کا سبب بنا۔ بہرکیف اب صحت مند ہیں اور ریڈیو اور ٹی وی کے علاوہ بڑی بڑی ''تقریبات'' میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

مہ ناز:

اپنے دور کی معروف گلوکارہ مرحومہ کجن بائی (کجن بیگم) کی بیٹی ہے۔ کجن کا تعلق بازار حسن سے رہا ہے لیکن گزشتہ طویل عرصہ سے انہوں نے وہاں سے اپنا تعلق ختم کر لیا تھا۔ کجن بیگم کی دو بیٹیاں ہیں اور دونوں ہی گلوکارائیں ہیں البتہ مہ ناز نے زیادہ شہرت حاصل کی۔ مہ ناز کو گلوکاری کی تربیت ماں نے ہی دی۔ مہ ناز نے فلموں میں پلے بیک گانے گائے جو بہت ہٹ ہوئے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ٹی وی پر بھی اپنے فن کا جادو جگایا۔ وہ فلم ٹی وی دونوں جگہ بہت مقبول رہیں۔ مہ ناز کو قدرت نے بہت سریلا گلا دیا ہے اور اس کی آواز میں جو سوز ہے وہ بہت کم گلوکاروں کی آواز میں ہوتا ہے۔ کجن بیگم ہر سال صرف محرم کے دنوں میں کراچی ٹی وی سے اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ سوز خوانی ومرثیہ خوانی کرتی نظر آتی رہیں۔ مہ ناز پہلے لاہور میں تھیں لیکن ملکہ ترنم نور جہاں کے چاہنے والے موسیقاروں کی سازش کا شکار ہو گئیں اور انہیں فلموں میں کم سے کم مواقع ملنے لگے۔ یہی حال ٹی وی کا رہا یوں سخت بدل ہو کر لاہور چھوڑ

کر مستقل طور پر کراچی چلی گئیں۔ایک مرتبہ پریس میں مہ ناز کے بارے میں یہ خبر چھپی تھی کہ انہوں نے ڈھولک والے سے شادی کر لی ہے۔جس پر مہ ناز نے سخت احتجاج کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اور ڈھولک والے (مراثی) سے کیسے شادی کر سکتی ہیں؟ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مہ ناز کا کہنا کہاں تک درست تھا۔

مہوش:

آج کے دور کی گلوکارہ ہیں۔خوش گلو کے ساتھ ساتھ خوش شکل بھی ہیں اس لیے ٹی وی کی سکرین پر ناظرین کو گاتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں۔گانے کے ساتھ ساتھ کھلی کھلی سی مسکراہٹ، آنکھوں کے اشارے اور ہاتھوں کی بھید بھاؤ سے سننے اور دیکھنے والوں کو مسحور کرتی ہیں۔گویا اسم با مسمی ہیں۔ٹی وی کی معروف گلوکارہ بلقیس خانم اور موسیقار محسن رضا کی حقیقی بہن ہیں۔ لاہور کے بازار حسن سے تعلق ہے اور وہاں پر بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتی رہتی ہیں۔لاہور ٹی وی کے موسیقی کے سینئر پروڈیوسر فرخ بشیر کی پسندیدہ گلوکارہ ہیں۔یہی وجہ کہ ان کے پروگرام میں یہ حشر برپا کرتی نظر آتی ہیں اور فرخ بشیر بھی انہیں ایسے ایسے خوبصورت زاویوں سے ایکسپوز کرتے ہیں کہ وہ واقعی مہوش نظر آتی رہیں۔لاہور سینٹر کے علاوہ بھی دوسرے ٹی وی سینٹروں سے اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہیں خصوصاً اسلام آباد سے۔جب کوئی خاص موسیقی کا پروگرام یا سٹیج شو ہو تو مہوش کو ضرور مدعو کیا جاتا ہے۔پی ٹی وی پر مہوش کی شکل وصورت اور آواز کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا ہے۔

زرقا:

براہ راست بازار حسن سے تعلق ہے۔فلموں کی معروف رقاصہ اداکارہ نازلی کی چھوٹی بہن ہیں۔یہ وہی نازلی ہے جس نے فلموں میں کردار اور رقص کر کے خوب شہرت حاصل کی۔

پشتو فلموں میں بھی بہت فحش اور عریاں رقص کیے۔مزاحیہ اداکار ننھا ''رفیع خاور'' نازلی پر عاشق ہو گئے تھے اور ان کا زیادہ تر وقت نازلی کے کوٹھے پر ہی گزرتا تھا۔پھر انہوں نے نازلی سے شادی کر لی اور اپنی ساری کمائی اس پر لٹا دی اس کے باوجود نازلی نے ان سے وفا نہ کی اور ننھا نے اپنی کنپٹی پر گولی مار کر خودکشی کر لی۔نازلی کی طرح زرقا کا رنگ بھی سانولا ہے اور چہرے کے نقوش بھی بہت تیکھے ہیں اور سانولے رنگ میں ایک خاص کشش ہے قدرت نے آواز بھی بہت اچھی دی ہے۔زرقا کو بھی سینئر ٹی وی پروڈیوسر فرخ بشیر نے خوب پروجیکشن دی اور انہیں اپنے متعدد پروگراموں میں بہت خوبصورت انداز سے پیش کیا۔زرقا کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب طارق عزیز شو شارجہ پہنچا تو زرقا کو بھی خاص طور پر ساتھ لے جایا گیا۔انہوں نے وہاں پر ہونے والے شوز میں پنجابی فوک گانے پیش کیے اور شو میں موجود سکھ ناظرین کو بھنگڑا ڈلوایا۔زرقا ٹی وی کے ساتھ نجی تقریبات اور اپنے دفتر میں ناچ گانے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔

اداکارائیں

یہ تو تھیں وہ گلوکارائیں جن کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق بازار حسن سے ہے اور جنہوں نے پاکستان ٹیلی وژن کو اس کے آغاز سے ہی شاد و آباد رکھا اور نام کمایا لیکن پی ٹی وی خصوصا لاہور سنٹر پر ایسی لاتعداد لڑکیاں اس بازار سے آ کر مختلف پروگرام جن میں علاقائی زیادہ ہوتے ہیں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہیں اور انکے بغیر ہمارے پروڈیوسرز کا گزارہ نہیں ہے۔ ان کے علاوہ پی ٹی وی کے خصوصی پروگرامز جن میں عید شو یا یوم آزادی کے حوالے سے سٹیج شو شامل ہیں میں جب تک حمیرا ارشد، سائرہ نسیم، شاہدہ منی وغیرہ شامل نہ ہوں تو ان شوز میں رونق اور چمک پیدا نہیں ہوتی۔ انجمن بھی گاتی تھی جبکہ باقی اداکاراؤں میں (نیلی، شاہدہ منی، وغیرہ) کو بڑے اہتمام سے سٹیج پر بلا کر ان سے گفتگو کی جاتی تھی۔ کون نہیں جانتا کہ ان سب کا تعلق بازار حسن سے تھا۔ اب آیئے ذرا اداکاری کے شعبے کی طرف یہ وہ واحد شعبہ ہے جس میں بازار حسن کے مال کی تعداد بہت کم ہے خصوصا پرانی اور مستند اداکاراؤں میں اوسط نہ ہونے کی برابر ہے۔

شکیلہ قریشی:

ملتان کے معرف بازار سے تعلق رکھتی تھی لیکن تسلیم نہیں کرتی تھی۔ ملتان سے لاہور آنے کے بعد انہیں ٹی وی تک پہنچانے کے لیے کئی خارزاروں سے گزرنا پڑا۔ لاہور میں اداکاری کی ابتداء اسٹیج سے کی۔ ٹیلی ویژن پر انہیں سب سے زیادہ پروجیکشن لاہور ٹی وی کے سینئر پروڈیوسر قنبر علی شاہ نے دی۔ دونوں کے درمیان کچھ افیئر بھی چلا۔ حتی کہ مشہور ہو گیا تھا کہ شاہ صاحب

نے شکیلہ قریشی سے نکاح کر لیا ہے۔ لاہور آنے کے بعد شکیلہ قریشی نے کچھ اچھی شہرت حاصل نہیں کی۔ ایک مرتبہ وہ ایک جیولر کے ہمراہ گاڑی میں کچھ قابل اعتراض حالت میں پولیس کے ہتھے بھی چڑھ گئیں تھی۔ لاہور ٹیلی ویژن کے متعدد ڈرامہ سیریلز میں کام کر چکی ہیں۔ ایک ڈرامہ سیریل ”پیاس“ میں انہوں نے ایک طوائف زادی کا کردار بے حد نیچرل انداز میں ادا کیا۔ ٹی وی سے فلم میں پہنچیں تو فلم والوں کے ”معیار“ پر پورا نہ اتریں۔ فلم والوں کی شکایت تھی کہ وہ جھگڑالو ہیں اور تنگ کرتی ہیں۔ پھر جب عمر شریف کا لاہور میں ورود ہوا شکیلہ قریشی کو فلموں میں بھی موقع ملنے لگا۔ عمر شریف نے شکیلہ سے شادی بھی کی دونوں میں جھگڑا ہوا اور طلاق ہو گئی۔ گویا وہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہو چکے تھے۔ ٹی وی سیریل ”پیاس“ کے بعد شکیلہ قریشی ٹی وی سکرین سے غائب رہیں البتہ عمر کے ساتھ سٹیج ڈراموں میں بے پناہ مصروف رہیں اور اب مستقل طور پر غائب ہیں۔

بابرہ شریف:

بابرہ شریف لاہور کے بازار حسن کی پیداوار ہیں ان کے والد کی بازار حسن میں گھی کی دوکان تھی جس کی وجہ سے سب لوگ انہیں شریف گھی والا کہہ کر پکارتے تھے۔ بابرہ نے کراچی ٹی وی سے اپنے فن کی ابتداء کی تھی۔ ویسے سب سے پہلے انہوں نے ایک ماڈلنگ میں حصہ لیا تھا۔ جس کے بعد انہیں شباب کیرانوی کی فلم ”میرا نام ہے محبت“ سے شہرت ملی۔ بابرہ کراچی ٹی وی سے ہونے والے ایک سیریل میں بھی حصہ لیتی رہیں اور این ٹی ایم کی بھی ایک سریل نادان نادیہ میں مرکزی کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ آج کل کراچی میں بسیرا ہے۔

ثمینہ چوہدری عرف مہوش:

یہ کوئی 1972ء کی بات ہے ان دنوں میں الحمرا آرٹ کونسل میں ڈرامے کیا کرتا تھا اور ڈرامہ آرٹسٹ ویلفیئر ایسوسی ایشن کا پبلسٹی سیکرٹری بھی تھا کہ ایک نئی لڑکی کو آرٹس کونسل میں

ڈرامے میں کام کرنے کے لیے کوشش کرتے دیکھا۔ یہ ناٹے قد کی دبلی پتلی لڑکی مجھے بہت بھلی لگی اور میں نے ''چا چارلیا'' میں ہی جو گجرات کے ایک ہال میں ہونا تھا اسے کاسٹ کرلیا۔ حمیرا چوہدری کے پاس چونکہ ٹائم نہیں تھا لہٰذا ثمینہ نے یہ کردار نبھانے کی حامی بھر لی۔ اس ڈرامے میں پہلی بار میں نے طارق جاوید کو کردار دیا تھا جو کامیاب اداکار اور ہدایت کار ثابت ہوا اور چند سال قبل سٹیج پر کام کرتے ہوئے خدا کو پیارا ہو گیا۔

چا چارلیا میں چونکہ انور علی بھی ایک مولوی کے کردار میں تھا لہٰذا انور علی اور ثمینہ چودھری کی آپس میں دوستی ہوگئی اور نوبت باقاعدہ عشق تک پہنچ گئی۔ دونوں اکٹھے بیٹھے ہوتے تو ثمینہ کہتی ''انور علی جب میں مجرا کر رہی ہوتی ہوں تو مجھے تم سامنے بیٹھے لگتے ہو۔'' دونوں کا عشق ایک سال چلتا رہا پھر ثمینہ اور انور علی نے شادی کی ٹھان لی۔ ثمینہ کی ماں بڑی سمجھ دار تھی جبکہ ثمینہ کی بہن زیب ابھی چھوٹی تھی۔ ثمینہ کی ماں شاہجہان نے انور علی اور اس کے دوست الیاس نجم سے کہا کہ اگر انور میری بہن سے شادی کرنا چاہتا ہے تو ایک الگ مکان کرائے پر لے اور چند روز تک ثمینہ اور مجھے وہاں رکھے تاکہ میں اندازہ لگا سکوں کہ وہ میری بیٹی کے اخراجات کا متحمل بھی ہو سکتا ہے؟ چنانچہ یہ سب سانده میں ایک مکان لے کر رہنے لگے۔ میں اس مکان میں گیا تو میں نے انور علی کو عجیب مخمصے میں دیکھا۔ کام اتنا ملتا نہیں تھا لہٰذا گزارا ہونا تو ایک طرف مکان کا کرایہ دینا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے دو ماہ گزارے اور پھر عشق رفو چکر ہو گیا۔ شاہجہان اپنی بیٹی ثمینہ کو لے کر واپس ہیرا منڈی (اونچا چیت رام روڈ) میں آ گئی اور پھر ثمینہ اور انور علی کی بول چال بند ہو گئی۔ ثمینہ سٹیج اور ٹی وی کے ڈراموں میں مگن رہی۔ اب وہ رقص چھوڑ چکی تھی لہٰذا کافی موٹی ہو گئی تھی اور اس نے اپنا نام بھی مہوش رکھ لیا تھا۔ اب بھی وہ اس نام سے ڈراموں میں مزاحیہ کردار ادا کرتی ہے۔

فیصل آباد کے ایک معزز شخص کی بیٹی جو شائد طوائف کے بطن سے تھی لاہور میں رہ رہی تھی۔ اس کا نام بینا تھا اس کا ایک مجذوب بیٹا بھی تھا جو 5 سال کا تھا۔ بینا کے تعلقات گجرات

کے ایک نوجوان سے ہو گئے اور نوجوان اس پر بری طرح فریفتہ ہو گیا۔ نوجوان اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ شادی نہیں چاہتی تھی اور پھر نوجوان کے گھر والے بھی رضامند نہیں ہو رہے تھے۔ ایک دن وہ نوجوان شکستہ دل کے ساتھ بینا سے ملنے اس کے گھر واقع ہیرا منڈی آیا اور اپنے ہی پستول سے اس کے سامنے خودکشی کر لی۔ یہ بھاگم بھاگ اسے بچانے کی کوشش کرنے لگی۔ اوپر کے پورشن والوں نے پولیس کو اطلاع کر دی۔ پولیس آ گئی تو بینا کو قتل کے الزام میں پکڑ کر لے گئی۔ بچہ ایک عورت کے پاس رہ گیا۔ اب کیس کی پیروی کرنے والا کوئی نہیں تھا لہٰذا ایک گواہ نے جھوٹا بیان دے دیا کہ قتل اس کے سامنے بینا نے کیا جس پر بینا کو پھانسی کی سزا ہو گئی لیکن ابھی اسے پھانسی نہیں ہوئی بلکہ ملتان جیل میں زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ بینا اکثر جیل سے اس عورت کو خط لکھتی رہی کہ بچہ کیسا ہے؟ اب تو ماشاءاللہ دس سال کا ہو گیا ہو گا لیکن بچہ بیمار ہو کر مر چکا تھا۔ اس عورت نے اسے مرنے کی خبر نہیں دی۔ وہ میرے پاس مشورے کے لیے آئی اور کہا کیا کروں؟ میں نے کہا کہ پہلے تم بیماری کا خط ڈالو تین چار خطوں کے بعد کہو کہ وہ اللہ کو پیارا ہو گیا اسے کب تک دھوکے میں رکھو گی؟ ادھر جس نے جھوٹی گواہی دی تھی قدرت نے اسے جھوٹ کا بدلہ دیا اور وہ ایک قتل کیس میں خود پھانسی چڑھ گیا۔

ایسی بہت سی کہانیاں اس بازار میں بکھری پڑی ہیں۔ مجبوریوں اور بے بسیوں کی داستانیں۔

ثمینہ خالد:

براہ راست لاہور کے بازار حسن سے تعلق ہے۔ چھوٹے موٹے کردار ٹی وی کے مختلف ڈراموں میں کرنے کے بعد انہیں منو بھائی کے لکھے ہوئے ڈرامہ سیریل سونا چاندی میں ایک اچھا کردار ملا۔ سونا چاندی سے انہیں کافی شہرت ملی جس کے بعد متعدد ڈراموں میں کام کیا۔ رہائش اب بھی بازار حسن میں ہے اور اپنا ذاتی کاروبار بھی کرتی ہیں۔ پھر انکی چھوٹی بہن روزینہ خالد بھی ٹی وی پر آ گئی۔ وہ بھی کئی ایک ڈراموں میں کام کر چکی ہے۔ فلموں میں اچھے کردار کی تلاش میں دونوں بہنیں تلی رہیں لیکن کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

سونیا:

اپنے دور کی بے حد معروف رقاصہ اداکارہ سلطانہ پشاوری کی بھتیجی ہے۔ آج کل تو سلطانہ پشاوری بازارحسن میں اپنا ذاتی مکان کرائے پر دے کر شاہ نور اسٹوڈیو کے سامنے ملتان روڈ پر اپنی ذاتی کوٹھی میں شفٹ ہوگئی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے سلطانہ پشاوری کی بیٹیاں ساحرہ اور کنول بازارحسن میں بیٹھتی تھیں۔ ان دنوں سونیا پوری طرح جوان نہیں ہوئی تھی۔ سونیا جوان ہوئیں تو انہوں نے فن اداکاری کی ابتدا فلم سے کی۔ فلموں میں انہیں یقیناً اچھے مواقع ملتے لیکن وہ فلموں میں جاتے ہی مشقیائی گئیں اور اداکار بابر سے شادی کر لی اور ایک سال بعد ایک بچے کی ماں بھی بن گئیں۔ فلموں کے بعد لاہور ٹی وی پر چند ڈرامے کئے۔ بعد ازاں انہیں کوئٹہ سینٹر کی ایک سیریل میں اہم کردار مل گیا جس سے انہیں کافی شہرت ملی۔ اس دوران سونیا نے اداکارہ بابر سے طلاق لے کر اداکار و فلمساز طارق سے شادی کر لی اور ملک سے باہر چلی گئیں۔

مہرالنساء:

براہ راست تعلق بازار حسن سے ہے پہلے ان کا قیام اس بازار میں ہی تھا اور وہیں کاروبار کرتی تھیں لیکن بعد ازاں لاہور کی جدید بستی علامہ اقبال ٹاؤن کے زینت بلاک میں کرائے پر گھر لے لیا اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ وہاں شفٹ ہوگئیں۔ اداکاری کی ابتداء سٹیج ڈراموں سے کی جس کے بعد ایک فلم ''کنوارہ باپ'' میں اداکاری کا موقع ملا لیکن یہ فلم کامیاب نہ ہو سکی جس کی وجہ سے انہیں فلموں میں مزید مواقع نہیں مل سکے۔ ٹی وی پر ابتداء بطور گلوکارہ کی اور ایک دو ریجنل پروگرام میں شرکت کی۔ گھر والے انہیں گلوکارہ ہی بنانا چاہتے تھے لیکن مہرالنساء کا رجحان اداکاری کی طرف تھا۔ بطور اداکارہ پہلی بار سینئر پروڈیوسر راشد ڈار اور مصنف

مستنصر حسین تارڑ کی ڈرامہ سیریل ''فریب'' میں کام کیا۔ کردار گو زیادہ اہم نہیں تھا لیکن مہرالنساء کی اداکاری نے اسے اہم بنا دیا اور ٹی وی ناظرین نے پسند کیا۔ اس کے بعد انہوں نے متعدد ڈراموں میں کام کیا۔ ایک ڈرامہ سیریل ''آنکھ اوجھل'' میں اداکاری کی۔ ایک پروگرام ''ہرتان ہے دیپک'' کی کمپیئرنگ بھی کی۔ اب جب سے مشرق وسطیٰ کے ایک شیخ سے انکا رابطہ ہوا ہے ٹی وی پر ان کی آمد کم ہوگئی ہے۔ نجی محفلوں میں رقص (مجرے) بھی کر لیتی ہیں۔ لاہور سینٹر کے ڈرامہ سیریل ''الاؤ'' میں بھی انہوں نے ایک طوائف زادی کا کردار ادا کیا۔ الاؤ میں سیمی زیدی نے بھی طوائف کا کردار ادا کیا تھا۔ شنید یہی ہے کہ سیمی کی امی پرانی اداکارہ تانی بیگم بھی ملتان کے اس بازار سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن فی الحال یقین سے یہ نہیں کہا جا سکتا البتہ ملتان سے تعلق رکھنے والی کچھ پرانی گلوکارائیں اس کی تصدیق کرتی ہیں۔

سٹیج اور ٹی وی کے ڈراموں میں بھی کام کرنے والی مہوش اور زیب کا تعلق اس بازار سے ہے اور اسی طرح کئی طوائفیں بھی اسی فن سے وابستہ ہیں۔

✿

مختلف واقعات

فیصل آباد میں الماس کی بیٹی کا اغوا:

چالیس برس قبل فیصل آباد کا بازار حسن جسے عرف عام میں چکلہ کہتے تھے جب عروج پر تھا تو یہاں لاتعداد طوائفیں آباد تھیں۔ یہ چکلہ امین پور بازار اور چنیوٹ بازار کے درمیان گول بازار اور اس کے عقب والی گلی میں ہوتا تھا۔ گلی کی طوائفیں ذرا اعلیٰ قسم کی ذات سے تعلق رکھتی تھیں کیونکہ ان کا کام گانا بجانا اور رقص کرنا تھا۔ اس گلی میں فیصل آباد (لائل پور) کے بڑے بڑے تاجر یا زمیندار رئیس تانگوں یا کاروں میں بیٹھ کر آتے اور رات گئے تک طوائفوں کے رقص دیکھتے اور شراب کے جام لنڈھاتے جبکہ گول بازار میں بیٹھنے والی زیادہ تر طوائفیں جسم فروشی کا کام کرتی تھیں۔ ان طوائفوں کا تعلق زیادہ تر صوبہ سرحد کے ملحقہ علاقوں سے تھا۔ وہاں سے لوگ لڑکیوں کے والدین کو روپے دے کر اور نکاح کر کے لے آتے اور یہاں چکلہ میں بٹھا دیتے۔ اس قبیح رسم کے خاتمہ کے لیے بہت سے اقدام اٹھائے گئے لیکن یہ برائی ختم نہیں ہوئی بلکہ انڈر گراؤنڈ ہوتی رہی۔ دنیا میں کوئی بھی برائی ڈنڈے، جبر یا طاقت کے بل بوتے پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کی وجہ دریافت کر کے اسے ختم کیا گیا۔ کارل مارکس کا کہنا تھا کہ روشن دانوں کو بند کر کے دھواں ختم کرنے کی بجائے وہ آگ بجھاؤ جہاں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ روس میں جب انقلاب آیا تو لنین کے سامنے یہ مسئلہ بھی آیا تھا کہ طوائفوں کا کیا کیا جائے؟ چنانچہ

انہوں نے تمام کامریڈوں کو ہدایت کی کہ ان سے شادیاں کر کے انہیں اچھا شہری بنایا جائے، انہیں نرسنگ کی تربیت دی جائے اور انہیں دوسرے باعزت پیشوں میں کھپایا جائے۔ اس طرح روس میں طوائفوں کا وجود ختم کر دیا گیا جبکہ یورپ اور امریکہ میں طوائفوں کو تو ختم نہیں کیا جا سکا بلکہ سرمایہ دارانہ نظام نے مزید لڑکیوں کو کال گرلز بنا دیا کیونکہ ضرورتیں پوری کرنے کے لیے انہیں جسم فروشی پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ ویسے بھی وہاں لبرل معاشرہ ہے اور جنسی طور پر بھی وہاں آزادی ہے۔

1962ء میں جب مغربی پاکستان کے گورنر امیر محمد خان نے جسم فروشی پر پابندی عائد کی تو صرف گلی میں طوائفیں رہ گئیں جن کا کام رقص اور گلوکاری تھا۔ اس گلی میں لائل پور کی مشہور طوائف الماس بھی رہتی تھی۔ جس کی بیٹی چھوٹی زہری بڑی خوبصورت، دلکش اور پرکشش طوائف تھی۔ وہ رقص بھی اچھا کر لیتی تھی۔ اس کی ابھی نتھ کھلوائی کی رسم ہونا باقی تھی۔ اس کے ہاں اس لڑکی کا مجرا دیکھنے لائل پور کے نواح کے زمیندار بھی آیا کرتے تھے۔ ایک زمیندار نے نتھ کھولنے کی آفر کی تو الماس نے ڈھیر سارے روپے مانگ لیے۔ اس زمیندار نے ایک محدود رقم بتائی اور کہا کہ ایک سال سے میں اور میرے دوست رقص دیکھنے آ رہے ہیں۔ کچھ تو لاج رکھو لیکن الماس نہیں مانی اور اس نے اس نوجوان کی پیشکش ٹھکرا دی۔

وہ نوجوان اس وقت کے بی ڈی ممبر (کونسلر) کا دوست تھا چنانچہ ایک پلان تیار ہوا کہ اس لڑکی کو اغوا کر لیا جائے۔ اب اغوا کیسے ہوا وہ بھی سن لیجیے۔ کونسلر نے ایک روز قبل بلدیہ کے بیلداروں کو حکم دیا کہ اس گلی کے امین پور بازار کی سائڈ پر جو لکڑی کے چھوٹے چھوٹے پلر کاریں یا تانگے روکنے کے لیے بنائے گئے ہیں انہیں اکھاڑ دیا جائے۔ وہ اکھاڑ دیئے گئے۔ رات کو نوجوان زمیندار اور اس کے حواری ایک کار میں بیٹھ کر آئے اور لڑکی کا رقص دیکھنے لگے۔ رقص کے دوران انہوں نے پھر آفر دی۔ الماس نے انکار کیا اور انہوں نے پستول کی نالی دکھا کر لڑکی کو بازو سے پکڑا، باہر گھسیٹا، کار میں ڈالا اور اپنے گاؤں میں لے گئے۔ الماس بائی

بھاگم بھاگ سامنے واقع کوتوالی میں پہنچی۔ جیسا کہ عام طور پر تھانے والے ٹرخانے کی کوشش کرتے ہیں اسے بھی درخواست دینے کا کہہ کر ٹرخا دیا۔ وہ بڑا تلملائی دوسرے روز کے اخباروں میں یہ خبر جلی طور پر شائع ہوئی لیکن بات بنی نہیں۔ الماس بائی پھر کوتوالی گئی تو کوتوال نے کہا کہ لڑکی کو چونکہ فلاں گاؤں میں لے جایا گیا ہے لہٰذا وہاں پرچہ درج ہوگا۔ الماس اور اس کے ساتھی اس گاؤں کے متعلقہ تھانے میں گئے تو تھانیدار نے کہا واقعہ چونکہ شہر میں ہوا ہے لہٰذا پرچہ شہر میں درج ہوگا۔ اس طرح الماس بائی اور اس کے ساتھی دونوں تھانوں کے درمیان کئی روز شٹل کاک بنے رہے۔ آخر وہ طارق سینما کے مالک بہادر خاں کے پاس پہنچے۔ بہادر خاں نے انہیں صلح کا مشورہ دیا اور کہا کہ لڑکی بھی واپس ہو جائے گی کچھ پیسے بھی دلا دوں گا۔ ادھر گاؤں میں لڑکی کا حشر کر دیا گیا ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ نتھ کھولی گئی اوپر سے دہشت بھی بس کچھ نہ پوچھیے۔

زہرا بائی کی ماں اور ملزمان کی صلح کرا دی گئی۔ لڑکی واپس آ گئی تو الماس نے سکھ کا سانس پھر بھی نہ لیا کیونکہ اب وہ کافی خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی حفاظت کے لیے پولیس کا پہرہ لگوا لیا۔ اس طرح پولیس کے سپاہی کئی ماہ تک الماس کے خرچے پر اس کی حفاظت کرتے رہے۔ الماس کی چھوٹی بیٹی عشرت بائی کا نکاح لائل پور کے ایک مسلم لیگی لیڈر اور چیئر مین بلدیہ چوہدری شیر علی سے ہوا۔ وہ اب تک شیر علی کی بیوی ہے اور گھر گرہستی سنبھالے ہوئے ایک سگھڑ عورت کے روپ میں زندگی بسر کر رہی ہے۔

دراصل ہر عورت اور ہر کال گرل کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایک اچھی بیوی، خدمت گار عورت اور مثالی ماں کے روپ میں زندگی گزارے لیکن یہ معاشرہ اور جس خاندان میں وہ بیاہی گئی ہو اس خاندان کے رشتے دار اسے جینے نہیں دیتے بلکہ طعنوں اور طنز کے تیروں سے اسے زخمی کرتے رہتے ہیں اور پھر شوہر بھی اسے چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسا مختلف طوائفوں اور کال گرلز یا ایکٹرسوں کے ساتھ ہوا ہے جنہوں نے پورے خلوص سے گھر بسانے کی کوشش کی

مثلاً میری ایک دوست اور تھیٹر کی مشہور اداکارہ شبانہ شیخ جب عروج پر تھی تو ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک زمیندار اس پر عاشق ہو گئے۔ اس زمیندار نے شبانہ شیخ کو شادی کی آفر کی اور شبانہ نے قبول کر لی۔ ہم سب کو اس شادی پر بڑی مسرت ہوئی کہ بی جی نجیبہ کی بڑی بہن پیا گھر سدھار گئی۔ یہ شادی کوئی چھ ماہ تک چلی۔ شبانہ پھر لاہور میں تھی اور کافی مایوس تھی۔ ہم نے شادی ختم ہونے کی وجہ پوچھی تو شبانہ شیخ نے بتایا کہ میں پیا گھر تو سدھار گئی لیکن ایک کمرے میں قید رہی۔ وہ کمرہ بھی گھر کے باہر کی طرف تھی۔ مجھ سے ہر عورت نفرت کرتی تھی اور اندر سے آواز آتی تھی ''کاکی جا باہر والی کو روٹی دے آ'' مجھے اچھی طرح ذلیل کیا گیا۔ اس دوران شادی کرنے والا بھی مجھ سے گھبرا گیا تھا کیونکہ اس کا شوق پورا ہو چکا تھا لہٰذا میں نے طلاق لینے میں ہی عافیت محسوس کی اور لاہور واپس آ گئی۔ شبانہ شیخ بی جی کی بڑی بہن ہے اور اب ابنارمل قسم کی ہو گئی ہے۔

زمرد کی کہانی:

زمرد لاہور کی ہیرا منڈی کی ایک معروف اور پرکشش رقاصہ تھی جو رقص کرتے ہوئے تماش بینوں کے دل موہ لیتی تھی۔ لائل پور کے ہی ایک گاؤں کے زمیندار کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اسے مجرے پر بلا لیا۔ وہ روپے کے لالچ میں اپنے سازندے لے کر اس کے گاؤں پہنچ گئی۔ گاؤں کی حویلی میں مجرے کا آغاز ہوا۔ مجرے کے خاتمہ پر ایک نوجوان آیا اس نے ہوائی فائرنگ کی اور زمرد کو اٹھا کر حویلی کے کمرے میں لے گئے۔ سازندوں نے شور مچایا تو ان کی خوب درگت بنائی اور انہیں طبلے سارنگیاں چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ زمرد کے ساتھ نہ صرف زمیندار بلکہ کئی آدمیوں نے زیادتی کی۔ زمرد کے لواحقین نے لاہور میں پرچہ درج کرانے کی کوشش کی تو لاہور کے تھانے والوں نے کہا کہ واقعہ چونکہ لائل پور کے گاؤں میں ہوا ہے اس لیے پرچہ اس گاؤں کے تھانے میں درج ہوگا جبکہ گاؤں والے کہتے تھے کہ پرچہ لاہور میں درج ہوگا جہاں سے کہ وہ اغوا ہوئی ہے۔ ان ہی چکروں میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ کچھ

معززین درمیان میں پڑے اور کچھ دے دلا کر صلح تک نوبت پہنچی۔ یوں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ طوائف کی زندگی کس قدر غیر محفوظ اور بے بس ہوتی ہے۔

غزل، غزالہ یا امبر:

ہمارا معاشرہ کس قدر منافق اور گرا ہوا ہے جو ظاہری طور پر بڑا پوتر اور شریفانہ نظر آتا ہے۔ اس کا اندازہ غزالہ کی کہانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ صرف غزالہ کی کہانی نہیں ہے بلکہ اس جیسی کئی لڑکیوں کی کہانی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ دولت کے بل بوتے پر پلنے اور زندہ رہنے والے لوگ اندر سے کیا ہوتے اور باہر سے کیا نظر آتے ہیں یعنی کہ جو کچھ نظر آتا ہے وہ نہیں ہے اور جو نظر نہیں آتا وہ ہے۔

غزالہ، غزل یا امبر ایک ہی لڑکی کے نام ہیں جو وہ موقع کے لحاظ سے بدلتی رہی ہے۔ اکثر کال گرلز اپنے نام تبدیل کرتی رہتی ہیں ایک ایسی ہی لڑکی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی نانی کہتی ہے کہ باہر کبھی کسی شخص کو اپنا اصل نام مت بتاؤ۔ ایسے ہی ایک لڑکی نگینہ نے اپنا نام عینی رکھا ہوا ہے اور پروین جو اب لندن جا چکی ہے کوئی اور ماڈرن نام رکھ کر اپنا جسم بیچتی رہی ہے۔ پھر اس کے ایک چاہنے والے نے اس سے ڈھیر ساری رقم لے کر اسے لندن پہنچا دیا یوں اب وہ وہاں اپنے کام میں مگن ہے۔

ہاں تو ذکر ہو رہا ہے غزالہ کا۔ غزالہ سے میری ملاقات 1970ء میں میرے ایک دوست طفیل اختر نے کرائی تھی۔ میں اسے مظلوم لڑکی سمجھتا تھا۔ اس وقت اس نے اپنا نام غزل رکھا ہوا تھا اور اسی نام سے میں نے اسے اپنے ڈرامے ''چاچا رلیا'' میں لائل پور کے لیے کاسٹ کر لیا۔ لائل پور میں اس ڈرامے کو کافی پسند کیا گیا تھا۔ غزل نے واجبی سا کام کیا لیکن ٹھیک ہی رہی۔ اس کے بعد اس نے مجھے کام کے سلسلہ میں باقاعدہ ملنا شروع کر دیا۔ مجھے ایک روز پتہ چلا کہ وہ نہ صرف شادی شدہ اور طلاق یافتہ ہے بلکہ ایک چار پانچ سالہ بچے کی ماں بھی ہے۔ وہ ان

دنوں سانده میں اپنی والدہ اور اس کے بوڑھے باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ والدہ کسی زمانہ میں نرس تھی وہ جوان تھی اور اسے ایک مالدار بوڑھا بیاہ کر لے آیا تھا۔ یہ بوڑھا کافی اچھے اور نامی گرامی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اندرون بھاٹی گیٹ رہتا تھا۔ غزالہ اس بوڑھے شخص کی بیٹی تھی۔ غزالہ جب تیرہ چودہ سال کی ہوئی تو اسے پتہ چلا کہ باپ چونکہ بہت بوڑھا ہے اور اس کی نظر بھی کمزور ہے لہٰذا اس کی والدہ کسی اور شخص کے دام محبت میں گرفتار ہے۔ یہ شخص ایک پوسٹ مین تھا۔ غزالہ کی ماں کو چونکہ دولت کا لالچ نہیں تھا بلکہ وہ محض اپنی جنسی آگ بجھانا چاہتی تھی لہٰذا اس نے پوسٹ مین سے دوستی کر لی تھی۔ پوسٹ مین خط دینے آتا تھا تو اسے وہ چوری چھپے اپنے بیڈروم میں لے جاتی۔ چند روز بعد لوگوں کو اس کا علم ہوا اور چہ میگوئیاں ہونے لگیں تو اس نے ایک نیا راستہ ڈھونڈ نکالا۔ اس نے اپنی تیرہ چودہ سالہ بیٹی غزالہ کی شادی اس پوسٹ مین سے کر دی۔ غزالہ کو چونکہ علم تھا کہ وہ ماں کا دوست ہے لہٰذا اس نے اس کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ ماں نے زبردستی لڑکی کو اس پوسٹ مین کے ساتھ رات گزارنے پر مجبور کیا۔ یوں پوسٹ مین کے تعلقات ماں بیٹی دونوں سے ہو گئے پھر وہ گھر داماد بن کر رہنے لگا۔ اب لوگوں کو اس کی رہائش پر اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن چہ میگوئیاں عورتوں میں اب بھی جاری تھیں۔ دراصل ہمارے معاشرے میں دوسرے کے عیب کا تو ذکر ہوتا ہے لیکن اپنی چارپائی کے نیچے کوئی جھاڑو نہیں پھیرتا۔

غزالہ کی ماں نے مجبور ہو کر بھاٹی گیٹ چھوڑ دیا اور مزنگ میں آ گئی۔ مزنگ میں غزالہ کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا اور پھر غزالہ نے اس شخص سے علیحدگی اختیار کر لی البتہ وہ اس گھر میں رہتا رہا۔ آخر کار غزالہ کی ماں نے سانده میں ایک مکان کرایہ پر لیا اور وہاں آ گئی۔ جن دنوں وہ میرے پاس کام لینے آئی تھی ان دنوں سانده میں رہائش پذیر تھی۔ اس کے ہاں آپریشن کے ذریعے بچہ پیدا ہوا تھا لہٰذا وہ مجھے کہتی تھی کہ میں کسی مرد کے قریب اس لیے نہیں جاتی کہیں حاملہ نہ ہو جاؤں۔ میں ترس کھانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

لاہور میں جب آرٹس کونسل کی سٹیج پر اس ڈرامے کو پیش کیا گیا تو غزل نے کہا کہ مجھے ہیروئن رکھا جائے۔ میں نے کہا مجھے استادوں نے بتایا ہے کہ فن کے معاملہ میں کبھی رعایت سے یا مصلحت سے کام نہ لو ورنہ مارے جاؤ گے۔ میں نے انکار کر دیا تو وہ مجھ سے ملنا چھوڑ گئی۔ میں نے اس ڈرامے میں حمیرا چودھری کو لیا۔ حمیرا چودھری بھی طوائف تھی لیکن ان دنوں سمن آباد میں رہتی تھی۔ اس نے بڑی خوبی سے کردار نبھایا بعدازاں وہ ایک کامیاب ٹی وی اداکارہ کے روپ میں سامنے آئی۔ اے جے کاردار نے فیض صاحب کی کہانی پر مبنی نیف ڈیک کی فلم ''پریت کی ریت'' میں حمیرا کو ہیروئن کے طور پر سائن کیا لیکن فلم مکمل نہ ہو سکی۔

ہاں تو کافی عرصہ بعد غزالہ مجھے مساوات کے دفتر میں ملنے آئی تو مجھے پتہ چلا کہ اب وہ کال گرلز کے روپ میں کرشن نگر کے کسی اڈے سے ہوٹلوں میں جاتی ہے یا اس اڈے کی مالکہ جس کے پاس اسے بھیج دے۔ کوئی بیس برس بعد پھر میں نے اسے سڑک پر دیکھا۔ مجھے اس نے سلام کیا تو میں نے پہچان لیا وہ کافی فیشن ایبل بن چکی تھی اور اس نے مجھے صاف بتا دیا تھا کہ وہ اب پیشہ ور کال گرلز ہے۔ 36 سے زیادہ ابارشن کرا چکی ہے اور باقاعدہ اسلم ڈوگر کے ہوٹل کی فہرست میں شامل ہے۔ اسلم ڈوگر ان دنوں شالیمار ہوٹل لبرٹی کا منیجر تھا۔ وہاں بھی میری ملاقات ہوئی تو اسلم ڈوگر کے سامنے اس نے اشارے سے مجھے منع کر دیا کہ واقفیت کے بارے میں نہ بتائے۔ اس کا بیٹا جوان ہو چکا تھا اور اس نے بھی غزالہ کو ملنا بند کر دیا تھا۔ غزل کا اب نام امبر تھا اور وہ اسی نام سے اسی ہوٹل کے گاہکوں کے پاس جاتی تھی۔ اس نے کئی شناختی کارڈ بنا رکھے تھے تا کہ چھاپے کے دوران پولیس کو غلط نام بتا کر جل دے سکے۔ کوئی 12 سال بعد پھر اس سے ملاقات ہوئی تو اس کے رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا بلکہ ایک سی کلاس جرنلسٹ عورت کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس صحافی خاتون نے میرا تعارف اس سے کرایا تو امبر نے پرانی باتیں بتانا شروع کیں لیکن اس کے گھر جا کر اس سے جھگڑ پڑی کہ اگر تمہاری واقفیت صحافیوں سے ہے تو میں تمہارے گھر میں نہیں رہوں گی۔ ایسا گھر تو میں ایک ہفتے میں بنا سکتی ہوں۔ اس

صحافی خاتون نے بتایا کہ اب امبر رات کو شراب پیے اور مرد کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں نے بڑا منع کیا کہ رات کو باہر مت جاؤ لیکن اسے چین نہیں ملتا۔ امبر نے جھگڑنے کے بعد اس کا بھی گھر چھوڑ دیا اور اسے غنڈوں سے دھمکایاں دلانے لگی۔

نگینہ خانم جنرل رانی کے بعد دوسری طاقتور خاتون:

یہ کوئی 1967ء کی ہی بات ہے کہ یونس ادیب مرحوم ان دنوں کسی روز نامے کے فلم ایڈیشن کے انچارج تھے۔ لاہور کے سینئر جرنلسٹ اعجاز رضوی سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی کیونکہ اعجاز رضوی، یونس ادیب اور اس کے ساتھی اے حمید سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ دونوں ادیب اچھے لکھاری تھے اے حمید کا تو ناول کی دنیا میں کوئی ثانی ہی نہیں تھا۔ اے حمید فطرت کے مناظر کی تصویر کشی بڑے مؤثر پیرایہ میں کرتے تھے۔ ان کے ناول ''جنگل روتے ہیں'' اور ''جہاں برف گرتی ہے'' میں نے لڑکپن میں پڑھے تھے۔ یونس ادیب اور اے حمید دنوں کا ٹھکانہ لارنس گارڈن ہوا کرتا تھا۔ ایک روز اچانک یونس ادیب، اعجاز رضوی سے ملا اور کہنے لگا ''شاہ جی میرے ساتھ چلیے ایک ابھرتی ہوئی اداکارہ کے گھر آپ کو بھی ساتھ لے کر جانا ہے کیونکہ انٹرویو کے لیے دو صحافی بھلے ہوتے ہیں۔'' چنانچہ اعجاز رضوی کو لے کر وہ نیا مزنگ گندے نالے پر واقع ایک مکان کے دروازے پر پہنچا۔ گھر کی بیل دی تو وہ دروازے پر آئی اور انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ ابھی بیٹھے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ گھر کی بیل پھر بجی۔ اداکارہ باہر گئی اور کہنے لگی کچھ مہمان آ گئے ہیں آپ تو اپنے آدمی ہیں پچھلے کمرے میں چلے جائیے چنانچہ دونوں صحافی پچھلے کمرے میں چلے گئے اور مہمان ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ ابھی بیٹھے پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ پھر بیل ہوئی اور یہ اور پچھلے کمرے میں آ گئے۔ وہاں اداکارہ سے بات ابھی شروع ہوئی تھی اور چائے بھی ابھی پی جا رہی تھی کہ پھر بیل ہوئی اور ان دونوں صحافیوں سے کہا گیا کہ آپ تو گھر کے فرد ہیں آپ کچن میں آ جائیے۔ یہ دونوں کچن میں آ گئے۔ کچن کی

طرف سے ایک کھڑکی باہر گلی میں کھلتی تھی۔ اعجاز رضوی نے یونس ادیب کی طرف دیکھا اور کہا ''بابا یہاں تو چھاپے کا خطرہ ہے بہتر ہے جان بچا کر بھاگ جائیں'' چنانچہ ان دونوں نے کھڑکیوں سے چھلانگیں لگائیں اور بگٹٹ بھاگتے ہوئے دفتر آ کر سانس لیا۔

یہ ابھرتی ہوئی خوبرو اداکارہ نگینہ خانم تھی۔ اس وقت بھرپور جوان تھی پھر جب عمر بڑھی تو علاقہ غیر سے لا کر لڑکیوں کی تربیت کرنے لگی۔ مجھے ایسے لوگوں سے ہمیشہ ہی نفرت رہی لہٰذا میری کوئی خاص واقفیت اس سے نہ ہو سکی ورنہ ہر فلم جرنلسٹ کو وہ بیٹا بنا لیتی تھی اور اس کو خوب سیوا کرتی تھی۔ ایسے ہی جرنلسٹوں میں خوشنود علی خان بھی تھا جس کا مستقل ڈیرا اس کے ہاں تھا اور وہ کھلم کھلا اس کو بیٹا کہا کرتی تھی اور خوشنود بھی اسے اپنی ماں ہی سمجھتا تھا۔ ایک بار میں نے خوشنود سے کہا کہ تماری ماں تمہیں سلام کہہ رہی ہے تو کھلکھلا کر ہنسا اور بولا ''زاہد عکاسی وہ اصل کنجری ہے۔''

نگینہ خانم جب ذرا پاپولر ہوئی اور اس کا کاروبار چل نکلا تو وہ علامہ اقبال ٹاؤن میں غالباً آصف بلاک میں آ گئی ان دنوں اس نے پشتو فلموں کے اداکار رب نواز سے شادی کر لی تھی۔ اب اس کے پاس گاڑی بھی تھی اور پھر اس نے رستم پارک میں ایک مکان لیا جہاں مسلم لیگ کا بورڈ لگا دیا اور خود پرائمری مسلم لیگ کی صدر بن گئی تھی۔ رب نواز تو کچھ عرصہ بعد کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر خالق حقیقی سے جا ملا لیکن نگینہ نے کینیڈا کے ایک شخص اکرم کو بیوقوف بنا کر اس سے شادی کر لی اور پھر اپنی ایک لڑکی چاند کو بھی وہاں بھجوا دیا جہاں اس کی شادی ہوگئی اور اس کے ہاں ایک بیٹی نے جنم لیا۔ نگینہ خانم کے قتل سے دو روز قبل وہ پاکستان سے کینیڈا چلی گئی تھی جبکہ دوسری بیٹی عنبر اس کے پاس ہی رہی اور جب نگینہ خانم اور دوسرے سات افراد قتل ہوئے تو سب سے چھوٹا بیٹا علی اوپر کے حصے میں سو رہا تھا جبکہ بڑا بیٹا نواز جس نے ایک بیوہ مالدار خاتون صائمہ سے شادی کر لی تھی سبزہ زار والے گھر میں تھا۔

نگینہ خانم کا بھی سات افراد کے قتل کا ایک ہولناک واقعہ تھا جس پر پولیس کی دوڑیں لگ

گئی تھیں پولیس نے اس سلسلہ میں کئی لوگوں پر شک کیا۔ 70 کے قریب لڑکیوں سے تفتیش بھی کی اور جب کچھ نہ ہوا تو کیس داخل دفتر کر دیا گیا جس طرح وزیراعظم لیاقت علی خان، جنرل ضیاء الحق، اعظم طارق اور دیگر لوگوں کے کیس پس پردہ چلے گئے اور ان کے قاتل آج تک پکڑے نہیں گئے۔

طریقہ واردات:

نگینہ خانم اقلیم اختر عرف جنرل رانی کے بعد دوسری طاقتور ترین خاتون تھی۔ اس کی رسائی کسی صدر مملکت تک تو نہ ہو سکی تھی لیکن اس نے مسلم لیگ کے عہدیداروں کو اور پولیس کے بڑے بڑے افسروں کو قابو کیا ہوا تھا۔ وہ نہ صرف مسلم لیگ کے پرائمری یونٹ کی صدر تھی بلکہ ایک شعبہ کی صدر بھی ہوگئی تھی اور اس نے شاہ نور سٹوڈیوز میں ایک کلچر اکیڈمی بھی کھول رکھی تھی جہاں غریب گھرانوں کی معصوم لڑکیوں کو تربیت کے بہانے بلا کر دھندے پر لگا دیا جاتا تھا۔ میڈم نگینہ خانم کے ایک سابق وزیراعظم، وزیراعلیٰ، وزیر دفاع، سابق ایس ایس پی لاہور، آرٹس کونسل کے افسران زبیر بلوچ اور نیاز حسین لکھویرا سے بھی مراسم تھے۔ 35 سالہ عیاش زندگی میں اس پر پولیس کے کئی ریڈ ہوئے لیکن اس کے خلاف کچھ بھی نہ ہو سکا۔ وہ مسلسل افغان لڑکیوں کو لا کر ان سے دھندہ کرواتی رہی اور پولیس کو اس کا بھتہ دیتی رہی کئی پولیس انسپکٹر اس کے بیٹے بنے ہوئے تھے۔

نگینہ خانم کے اڈے پر بڑے بڑے تماش بین، بیوروکریٹس، پولیس افسران بھی آتے رہے۔ اس کے رسالہ ''عنبر'' کی افتتاحی تقریب پر بلوچستان کے جام محمد یوسف اور صوبائی وزیر عبدالحمید دستی بھی تشریف لائے تھے۔ عنبر کی تیسری سالگرہ پر مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا اور یہ تقریب فلیٹیز ہوٹل میں ہوئی تھی۔ میری طرح کچھ اور صحافی بھی موجود تھے اور بعض ایسی شخصیات بھی تھیں جن کے دم قدم سے حکومت چلتی ہے۔ مہمانوں کا استقبال بڑے پرتپاک انداز میں کھنکتی

چوڑیوں اور زرق برق لباس کے ساتھ حسین وخوبصورت تتلیاں کررہی تھیں۔ میڈم نگینہ خانم جسے سب بیگم رب نواز کہہ رہے تھے مسلم لیگ کی رہنما اینہ غنی گھمن کو خود جلو میں لے کر آئی پھر جام محمد یوسف اور مسلم لیگ بلوچستان کے نائب صدر حاجی سیف الدین جوگیزئی بھی تشریف لائے۔

تقریب کی کاروائی کا آغاز اینہ غنی گھمن کی تقریر سے ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ میڈم نگینہ خانم عرف بیگم رب نواز خدا ترس خاتون ہے اور وہ نئے فن کاروں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ مسلم لیگ کو بیگم رب نواز پر فخر ہے کیونکہ اس نے ہر قدم پر مسلم لیگ کے لیے کام کیا ہے۔ صدر پاکستان مسلم لیگ شعبہ خواتین محترمہ نجمہ حمید نے بھی نگینہ خانم کی تعریف کی اور جوائنٹ سیکرٹری مسلم لیگ ایس ایم بشیر نے بھی کہا کہ بیگم رب نواز قومی خدمت اپنے رسالہ کے ذریعے کررہی ہے۔ وفاقی وزیر نے عنبر کے لیے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔

نگینہ خانم پر جب چھاپہ پڑا تو نگینہ خانم کا ایک بیان 9 مارچ 1989ء کے مساوات میں چھپا جس میں نگینہ خانم نے کہا کہ مسلم لیگی وزیر سردار عبدالحمید دستی نے میری تاجپوشی کی جبکہ اینہ غنی گھمن نے مجھے چھوٹی بہن سمجھا اور وہ مجھے مسلم لیگ میں لے کر آئیں۔ مساوات میں ہی ایک ایسی لڑکی کا خط بھی چھپا جو نگینہ خانم کے ظلم کا شکار رہی تھی۔ یہ خط ریاض صحافی کو ایک کال گرل نے لکھا تھا اور اس نے بپتا بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

''میں میڈم کے پاس ٹیچر بننے گئی تھی اور اس نے نوکری دلوانے کی حامی بھری تھی اور پھر مجھے کچھ رقم ادھار دے کر اسٹام پیپر لکھوالیا تھا کہ میں 25 ہزار روپے واپس کردوں گی۔ کچھ دنوں بعد کہنے لگی میں تمہیں بابرہ شریف یا نیلی بنادوں گی۔ اس دوران وہ مجھے زبردستی نئے کپڑے اور جوتے لیکر دیتی رہی۔ جب میں پوری طرح اس کے شکنجے میں آگئی تو مجھے کال گرل بننے پر مجبور کرنے لگی میں نے انکار کیا تو آگ بگولا ہوگئی۔ آخر مجھے اس کے آگے ہتھیار پھینکنے پڑے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ وہ گاہک سے ایک ہزار روپے لیتی ہے اور 5 سو مجھے تھمادیتی ہے اور

میں یہ کام مجبوراً کرتی ہوں تاکہ اپنے بوڑھے والدین اور چھوٹے بہن بھائیوں کا پیٹ پال سکوں۔ اس نے لکھا تھا کہ میں پنجاب کے ایسے بیٹے کی منتظر ہوں جو مجھے اس جہنم سے نجات دلا سکے۔

بہر طور اب نگینہ خانم ماضی کا حصہ بن چکی ہے آخری دنوں میں مجھے ندیم چشتی اس کے گھر لے کر گیا کہ وہ آپ کو رسالہ کا ایڈیٹر بنانا چاہتی ہے لیکن میں نے جان بچانے میں ہی عافیت محسوس کی تھی اور کہا تھا کہ فدا احمد کاردار کے کہنے پر تم نے ڈیکلریشن لیا تھا اب اسے ہی ایڈیٹر بناؤ۔ چند دنوں بعد پتہ چلا کہ نگینہ خانم قتل ہوگئی اور یوں وہ اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

✿

ایک طوائف کا خط

اسلام آباد

بابو جی!

میں نے وعدہ کیا تھا کہ فرصت ملتے ہی رابطہ کروں گی لیکن ہمارے مقدر میں شب تعطیل کہاں؟ اپنی زندگی کا دستور مختلف ہے جاگنا اپنا ہے نہ سونا، قہقہے اور آنسو بھی بیگانے ہیں۔

میں ''حسن و جوانی برائے فروخت'' کا ایک قومی اشتہار ہوں۔ میرا بستر ''پبلک پراپرٹی'' ہے۔ گزرگاہ عام! ہمارا کچھ بھی اپنا نہیں ہوتا، خلوت گاہ اور نیند بھی۔

میں عین شباب میں بڑھیا ہوں، جوانی کی ہر نعمت سے محروم۔ طوائف زندگی کے قبرستان میں ایک سرد لاش ہوتی ہے۔ قصاب کی دکان میں ٹھنڈا گوشت، جسے دو ٹانگوں والا کوئی نہ کوئی کتا نمک مرچ لگا کر چاٹ کھاتا ہے۔ میں راتوں کو جاگتی، دن بھر سوتی، بغیر آنسوؤں کے روتی، نہ چاہتے ہوئے ہنستی، یخ آتش دان اور سلگتی اور دستر خوان پر اپنا جو جسم سجائے رکھتی ہوں، میں کرائے کی بیوی ہوں۔ ایک فرمائشی محبت اور عصمت فروشی کی دکان۔ یہ دکان میں نے نہیں کھولی تھی۔ اس تھڑے پر فقط چمڑا بکتا ہے۔ خریداروں کی فہرست میں کئی پردہ نشینوں کے نام ہیں۔ اعلیٰ افسران، سیکرٹری صاحبان نیز وزیروں، سفیروں اور امیروں کے نام۔ منبر و محراب کے چند برہمن، عزت ماب، حضرت مولانا اور قبلہ گاہ۔ یہ دکان میں نہیں میرے گاہک چلاتے ہیں۔ دکاندار تو وہی مال فروخت کرے گا جو خریدار چاہیں میں ایک کھوٹا سکہ ہوں مگر یہ

بازار میں چلتا ہے۔

یہ بھنورے ہر عورت کا مرد بننا چاہتے ہیں۔ لازم ہے کہ اپنی بیگمات کو بھی ''عام اجازت'' دے دیں۔ ظالم اپنی بیویوں سے دغا کرتے ہیں۔ ان بیویوں سے جن کا تصور بھی پردے سے باہر نہیں نکلتا۔ سرِ راہ جن کی آنکھوں میں شہوت کی سرخی کبھی نہیں لہراتی اور اگر شوہر قریب سے بھی گزریں تو حاملہ ٹھہر جاتی ہیں۔ وفا کی پیکر ہمیشہ حیاء کی چادر میں ہوتے ہیں۔ آدم کی بیٹیوں کی فطرت اور ہے حوا کی بیٹی کا مزاج کچھ اور۔ مرد بھیڑیئے کی طرح خونخوار، کوے کی طرح عیار اور لومڑی کی طرح مکار ہیں۔ ان کا کاروبار جنس بھی شریعت کا لباس پہن کر آتا ہے۔ مردوں کے نزدیک نکاح کے معنی محض کپڑے اتارنا ہیں۔ لہٰذا میں ہر رات مختلف نکاح کرتی اور صبح مطلقہ ٹھہر جاتی ہوں۔ کہتے ہیں کہ بدکاری بہت بڑا جرم ہے مگر شاید فقط عورت کے لیے۔ میں بھی زنا کو گناہ سمجھتی ہوں لیکن مرد کو بے گناہ نہیں۔ ویسے بھی عورت نے برائی کی طرف اپنے طور پر کبھی پہلا قدم نہیں اٹھایا۔ تم ہی مکڑی کا جال بچھاتے اور قسمیں کھا کھا کر پھنساتے ہو۔ سچ یہ ہے کہ جب کوئی مرد یہ کہتا ہے کہ فلاں لڑکی سے پیار کرتا ہوں تو اس کا حقیقی ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ عشق کے نام پر اسے مادر زاد ننگا دیکھنے کا تمنائی ہے۔ اگر اس جنسی درندہ کے بستر سے ہزار عورت بھی گزر جائے تو قانع نہیں ہوتا بلکہ ''اور لا'' کا تقاضا کرتا رہتا ہے۔ اگر عورت ایک مرد پر قناعت کر سکتی ہے تو مرد کج فطرت کیوں ٹھہرا؟

اس معاشرے میں بہر صورت عورت کو لوٹا گیا ہے۔ تحفظ اور عدم تحفظ کا احساس دلا کر بھی۔ طوائف محض میلی نظروں کی گزرگاہ اور اعلیٰ نسل کے انسانی درندوں کی خوراک ہوتی ہے، عورت نہیں ہوتی۔

بازار کی لغت میں کنیا، دوشیزہ، عفیفہ، سیتا، کنواری اور دروپدی کے حوالے نہیں چلتے بلکہ نائیکہ، رنڈی، بیسوا اور......... کی فطرت کی اصطلاحیں رائج ہوتی ہیں۔ میرے ماحول میں کرنسی سے ایک ہی کام لیا جاتا ہے اور وہ ہے جسموں کی پیمائش۔ ہاں اگر کوئی فیتہ بھی ساتھ لے

آئے تو اعتراض کیا؟ جنس کے خریدار' اس مال کو ٹٹول ٹٹول کر بھاؤ پوچھتے اور بھاؤ پوچھ پوچھ کر ٹٹولتے ہیں، جو کپڑوں میں چھپا ہے۔ تم لوگ ہمیں فاحشہ کہتے ہو حالانکہ ہم تو انتہائی مخلص، خوش مزاج اور فراخ دل ہوتی ہیں۔ بخوشی ہر قیمت ادا کر سکتی ہیں۔ جہاں بھی بھیجو چلی جائیں گی۔ الہڑتا، چھلکتا سینہ لیے۔

تعارف، تعلق اور مراسم ہمارا پیشہ ہے۔ بعض ''مہم جو'' ہمیں سب سے اچھی سفارش خیال کرتے اور افسران کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ کبھی بہن، کبھی بیگم اور کبھی بیٹی کے طور پر۔

ہمیں بہرحال پسند کیا جاتا ہے۔ یوں بھی بعض لوگوں کے فلسفہ میں ''سیکنڈ ہینڈ گاڑیاں'' زیادہ رواں چلتی ہیں حالانکہ جس کا کردار پاک نہ ہو وہ عورت نہیں تاریخ کا عجوبہ ہوتی ہے۔

ہرجائی اور احمق مرد عورت کو بستر کے پھولوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ جب تک خوشبو اور تر و تازگی رہی، زینت بنائے رکھا اور جونہی کملائے، پھینک دیا۔ انہیں کون اور کس طرح سمجھائے کہ کپڑے اتر جائیں تو دنیا کی ہر عورت بالکل دوسری عورت کی طرح ہے۔

کسی نے سچ ہی تو کہا ہے کہ ''مرد کے جسمانی تقاضے روحانی تقاضوں سے زیادہ قوی ہوتے ہیں'' جوں جوں کمزور و ناتواں ہوں زیادہ زرخیز اور ناتواں لڑکی چاہتے ہیں نئے اور تازہ خون کے رسیا!۔

معاشرے میں ہر اخلاقی قدر بکتی ہے۔ ہر ایک اصول فروخت ہوتا ہے۔ قانون فروخت ہوتا ہے، انصاف اور منصف فروخت ہوتے ہیں۔ ہر رشتہ فروخت ہوتا ہے۔ گویا یہ ایک منڈی ہے اور یہاں سے ہر تعلق پر وہی رواج نافذ ہوتے ہیں۔ دنیا کے بازار میں ہر شے بکتی ہے۔ محبت کے رشتے بھی بکتے ہیں اور عظمت و عصمت بھی بکتی ہے۔

معاشیات میں یہ اصول کارفرما ہے کہ بڑا مگرمچھ، چھوٹے کو ہڑپ کر جاتا ہے۔ اسی طرح جنس میں بھی بڑی مچھلی اور چھوٹی مچھلی والا ضابطہ رائج ہے۔ ہر ایک شخص اپنے سے بڑے کو عزت و آبرو کا خراج دیتا اور چھوٹے سے وصول کرتا ہے۔ بہت سے لوگ ہر شب ایک نیا

ذائقہ چاہتے ہیں چہروں اور جسموں کا ذائقہ۔ ان کا اپنی بیویوں کے ساتھ محض ایک دفتر یا محکمے کا رشتہ ہوتا ہے۔

کوئی بھی عورت فاحشہ نہیں ہوتی۔ اسے آپ یوں کہہ بھی سکتے ہیں کہ درحقیقت کوئی فاحشہ عورت نہیں ہوتی۔ عورت ایک تاج محل ہے جیسے کسی طور خریدا نہیں جا سکتا۔ طوائف کے پاس فقط ایک بستر ہوتا ہے عورت نہیں ہوتی۔ تمام طوائفوں کی کہانی ایک ہی طرح کی ہوتی ہے اور کہانی جو دراصل پورے معاشرے کی بدکاریوں اور سیاہ کاریوں کی روداد ہے۔

میں مانتی ہوں کہ طوائف کا دوسرا نام فریب ہے۔ لیکن کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ فریب کار کون ہے؟ میں گناہ ہوں تو تم گناہ گار ہو۔ عورت کا ہر فطری روپ مقدس ہے مگر طوائف اس کی بھٹکتی ہوئی روح کا نام ہے۔

بیسوا شادی نہیں کرتی لیکن اس کے خاوند بے شمار ہوتے ہیں۔ ہر رات نئی شادی اور ہر صبح تازہ طلاق۔ ایک بات بتاؤں؟ سوسائٹی کے روپ بہروپ اور مردوں کے حقیقی چہروں کو فقط ''طوائف'' جانتی ہے۔ وہ کچھ بھی جانتی ہے جو کوئی اور نہیں جانتا۔ آپ کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ عصمتوں کے محافظ ہی اس کے خریدار بھی ہیں۔ تم تو صرف یہ جانتے ہو کہ بدکاری فقط ''چکلوں'' میں ہوتی ہے حالانکہ ''بازارِ حسن'' کی دیواریں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر نہیں میں اس بازار کا حدود اربعہ نہیں بتانا چاہتی۔ وگرنہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ہوسٹلوں میں رہنے والی لڑکیاں بھی زد میں آ سکتی ہیں۔ اخبار کے ایڈیٹر، انتظامیہ کے اعلیٰ افسر، عدلیہ کے بعض ارکان اور بھی نہ جانے کون کون؟

''سیاسی ہمزلفوں'' کی بات چھوڑیئے کہ وہ تو! میں نے کس کس آدمی کو اپنا جسم دیا ہے؟ نہ پوچھیے! اگر میں ان کے نام گنوانے بیٹھ گئی تو چکرا جاؤ گے۔ بس اتنا سمجھ لیجئے کہ ''مملکت پاکستان'' کی نوکر شاہی کا پورا نظام، شراب نوشی اور عصمت فروشی پر چلتا ہے۔ بڑے بڑے قانون ساز بھی میرے سامنے آکر ننگے ہو جاتے ہیں۔ تم کو تو شاید یہ بھی خبر نہ ہو گی کہ مختلف

محکموں میں لڑکیوں کو ملازمت کے لیے منتخب نہیں کیا جاتا بلکہ پسند کیا جاتا ہے۔ خوبصورت اور جوان سال لڑکیاں۔ طوائف وہ بدقسمت جانور ہے جس کا ماضی کبھی اور کہیں بھی دفن نہیں ہو سکتا۔ ماضی کے منحوس سائے ہمیشہ حال اور مستقبل پر ہی منڈلاتے رہتے ہیں۔

مرد سمجھتے ہیں کہ وہ کسی لڑکی کو پھنسا کر فاتح بن رہے ہیں۔ ان کی جنسی خواہشات کے غلبہ سے ہی یہ سارا کاروبار چلتا ہے۔ ان کو ہمارے گوشت کی چاٹ پڑ چکی ہے۔ یہ مذہب کے پردے میں بھی کھلے بستروں اور ننگے جسموں کے طلب گار ہوتے ہیں۔ تم کیا ہوا اور تمہارا مذہب کیا؟ مذہب کے نام لیواؤں نے تو اپنے نفسیاتی جذبات کی تسکین کے لیے متعہ اور حلالہ بھی مشرف بہ اسلام کر لیے ہیں۔ تمہاری عبادت بھی حوروں کی تجارت ہے۔ جنت میں ایک مرد کو کم از کم ستر حوریں ملیں گی اور بے چاری عورت کو صرف گھسا پٹا مرد۔ یہ تصور جنت بھی عورت کے لیے جہنم سے بدتر ہے۔

محبت کے سلسلے میں عورت کے نظریات بڑے پاکیزہ ہوتے ہیں۔ لڑکی زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے۔ یہ محبت کے عوض کچھ نہیں مانگتی یہاں تک کہ محبت کے عوض محبت بھی نہیں۔ محبوب کو دیوتا سمجھ کر پوجا کرتی ہے۔ مرد کے پیار میں ماسوائے جنس کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ بانہوں کی قوسیں، پلکوں کی آواز، ہونٹوں کی شراب، بدن کے حوالے، سینے کا ابھار اور آزار بند کی شکست مانگتا ہے۔ روحانی چیخوں پر جسمانی قہقہے بکھیرتا اور غلاظت کے ڈھیر سے پھولوں کو تلاش کرتا ہے۔ مرد کا کیا ہے؟ اس کی زندگی میں شہوت کا ایک عریاں لمحہ آیا اور گزر گیا لیکن عورت کے مقدر میں یہی ''ایک لمحہ'' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھہر جاتا ہے۔ اگر ایک بار کپڑے اتر جائیں تو پھر اترتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اف اللہ! اس قدر مہنگی شے اور اتنی ارزاں۔ یا وہ بلندی یا یہ پستی۔ سماج نے عورت کو کیا سے کیا بنا ڈالا؟........

میں آپ کو یہ بھی بتاتی چلوں کہ موروثی طوائفیں اپنے نسب سے فی الواقع معزز اور خاندانی ہیں۔ معاشرے میں بڑے آدمیوں کو ہی خاندانی کہا جاتا ہے نا!

میں لاہور میں تھی تو یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوتی رہی کہ میں ایک ایسے ''نظریاتی ملک'' کی باشندہ ہوں جس کی تاریخی مسجد کے سائے میں قانوناً عصمتوں کے سودے چکائے جاتے ہیں۔ اور اب ''اسلام آباد'' میرا ٹھکانہ ہے۔ اسلام کے نام پر حاصل کیے جانے والے ملک کا دارالحکومت! کیسا ملک کیسا اسلام؟ آج کی نشست میں مزید کچھ لکھنا ممکن نہیں دکھائی دے رہا تاہم اگر مسلمان بھائیوں کی ''تواضع'' سے فرصت ملی تو اپنے احساسات پھر کبھی لکھ بھیجوں گی۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتی ہوں۔

طوائف زادی: کرن گوگی

✿

طوائف اور فلم

طوائف فلم انڈسٹری کا ہمیشہ سے ہی محبوب موضوع رہا ہے۔ دیکھا جائے تو برصغیر کی فلموں میں سب سے پہلے طوائف نے ہی عورت کا کردار نبھانے کی حامی بھری کیونکہ اچھے خاندانوں اور معاشرے کے شریف لوگوں نے شروع میں فلموں کو بدمعاشی کا گڑھ سمجھا تھا۔ انہیں شاید یہ پتہ نہیں تھا کہ فلم ابلاغ کا سب سے بڑا اور بہترین ذریعہ تھا۔ ان دنوں فلمیں دیکھنا بھی عیب ہی میں شمار ہوتا تھا اور جو کوئی لڑکی یا لڑکا بھاگ کر فلم انڈسٹری میں کام کی تلاش میں جاتا تھا اسے ڈرا دھمکا کر اور مار پیٹ کر بمبئی سے واپس لایا جاتا تھا۔ یہ بات طے شدہ تھی کہ اس میں نہ تو شریف لوگ کام کرتے ہیں اور نہ ہی شریف لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ٹیکنالوجی کے آگے بند نہیں باندھا جا سکتا بلکہ سائنس نے آگے ہی آگے بڑھنا ہے اور دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینا ہے یہ درست ثابت ہوا۔ اب سائنس کی لپیٹ میں پوری دنیا آ چکی ہے۔ ٹیکنالوجی کی ترقی نے کمپیوٹر ایجاد کر کے سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے اور اب سینما کی اہمیت کو تسلیم کیا جانے لگا۔ نہ صرف یہ بلکہ گھر گھر میں ٹی وی نے اب اسے تفریح، تعلیم اور معلومات کا خزانہ بنا دیا ہے۔ ٹی وی والے کھلے بندوں اس بات کا درس دیتے ہیں کہ ٹی وی' وگیانک' آرتھک' ساجک اور راج نیتک کے علاوہ منورنجن کا بھی اہم ذریعہ ہے۔ اب سیاستدانوں' دانشوروں اور سماج کے نیتاؤں کو بڑے بڑے جلسے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ وہ ٹی وی پر آ کر مذاکرے' تقریریں اور لیکچر دے سکتے ہیں اور اس سے ناظرین براہ راست

استفادہ کر سکتے ہیں۔

برصغیر میں یا تو طوائفوں نے فلموں میں کام کیا یا طوائفوں پر فلمیں تیار کی جاتی رہی ہیں اور طوائف پر تیار ہونے والی فلم ہمیشہ ہی کامیاب رہی ہے۔ شانتارام نے سب سے پہلے ایک طوائف کی زندگی کی جھلک ہندی فلم ''آدمی'' اور مراٹھی فلم ''مانش'' میں اپنے منفرد انداز میں پیش کی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ شانتا ہبلیکر کس طرح ایک سپاہی کی زندگی میں انقلاب لاتی ہے۔ پھر بمل رائے نے ''دیوداس'' میں وجنتی مالا کو چندر مکھی نامی طوائف کے رول میں پیش کیا جو ''دیوداس'' کی ہر قدم پر معاونت کرتی ہے۔ اس کے سینے میں ایک عورت کا سونے جیسا دل ہے۔

''دیوداس'' کو ہی دوبارہ سنجے لیلا بھنسالی (ہدایتکار) نے جب 2003ء میں تیار کیا تو اس میں طوائف کے کردار کو اداکارہ ''مادھوری ڈکشٹ'' نے بڑے ہی اعتماد اور رعب ودبدبہ کے ساتھ پیش کیا۔ اس میں طوائف نے تماش بین کو نیچا دکھا دیا۔ وہ اس طرح کہ جب دیوداس (شاہ رخ) اس کے رقص کی قیمت چکانے کے لیے نوٹوں کی گڈی کو ہاتھ میں رکھ کر معاوضے کے طور پر دینا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ طوائف کی قیمت صرف روپیہ ہے تو وہ کہتی ہے بابو جی جس روپے پر تم اتنا اترا رہے ہو اور جو تمہارے ہاتھ میں ہیں یہ طوائف کے پاؤں میں ہوتے ہیں اور ان نوٹوں کو ٹھکرا دیتی ہے اور ''دیوداس'' کا اس کی بیماری اور موت تک ساتھ دیتی ہے۔

کیدار شرما نے نرتکی (رقاصہ) کے روپ میں نامور اداکارہ مہتاب کو چترلیکھا میں پیش کیا کہ وہ کس طرح بڑے بڑے سادھوؤں کی تپسیا بھنگ کر کے ثابت کرتی ہے کہ عشق ہی ایک سچا جذبہ ہے۔ اسی طرح جب دوبارہ اس فلم کو رامانند ساگر نے رنگین بنایا تو اس فلم میں نرتکی کا کردار مینا کماری نے ادا کیا جو راجہ کے بیٹے ''پردیپ کمار'' سے محبت کرتی ہے اور اسے سمجھانے کے لیے ایک سادھو (اشوک کمار) آتا ہے۔ اشوک کمار اسے نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے اے نرتکی تو جس حسن پر اتنا ناز کر رہی ہے یہ حسن چند روزہ ہے اور جب تمہاری جوانی ڈھلے گی تو

پچھتائے گی۔ اس لیے چھوڑ لب و لعل کو اور بھگوان سے دل لگا لے تاکہ تیری زندگی سپھل ہو جائے۔ (وہ جانے لگتا ہے تو مینا کماری گاتی ہے)

سنسار سے بھاگے پھرتے ہو بھگوان کو تم کیا پاؤ گے
اس یگ کو بھی اپنا نہ سکے اس یگ کو بھی گنواؤ گے
یہ پاپ ہے کیا اور پن ہے کیا ریتوں پر دھرم کی مہریں ہیں
ہر یگ میں بدلتے دھرموں کو تم آدرش بناؤ گے!

اسی طرح بی آر چوپڑہ کی طوائف حالات سے سمجھوتہ کرنے پر قطعاً تیار نظر نہیں ہوتی۔ اس کی مثال، ''گمراہ'' اور ''طوائف'' فلموں سے ملتی ہے۔ کمال امروہی نے ''پاکیزہ'' بنا کر مینا کماری کو امر بنا دیا جبکہ سہراب مودی نے ''پرکھ'' میں طوائف کے مسئلہ کو اجاگر کیا۔ اس فلم میں مہتاب نے اسقدر زوردار اداکاری کی کہ وہ سہراب مودی کی بیوی بن گئی۔

شیام بینگل نے ''بھومیکا'' میں اپنے زمانے کی نامور اداکارہ ''شانتا'' ہیلیکر کی حقیقی داستان فلمائی جس میں بتایا گیا کہ کس طرح ایک ایکٹرس بھی اپنے شوہر کی حرص کا شکار رہتی ہے۔ پھر طوائف کے مسئلہ پر انہوں نے غلام عباس کے ناول آنندی پر فلم ''منڈی'' تیار کی۔ اس میں طوائف کا مرکزی کردار ہے اور اس کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کہتے ہیں کہ اس فلم کی ہیروئن شبانہ اعظمی نے پورے چھ ماہ تک طوائفوں کے کوٹھوں پر جا کر ان کی حرکات و سکنات کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ اس فلم میں شبانہ اعظمی اور سمیتا پاٹل نے اپنی فطری اداکاری سے تماشائیوں کے دل جیت لیے تھے' شیام بینگل کی عورت ہمیشہ روایت سے بغاوت کا سبق دیتی نظر آتی ہے۔

گلزار کی فلم ''موسم'' بھی ایک طوائف کی زندگی کے گرد گھومتی ہے۔ پہاڑی علاقے میں رہنے والی ایک لڑکی (شرمیلا ٹیگور) اپنے محبوب کی فرقت میں گھر سے نکلتی ہے اور ایک طوائف

بننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

مندروں میں دیوداسی کے کردار پر ایک فلم ''آہستہ آہستہ'' تیار ہوئی جس میں بتایا گیا کہ غریب لڑکی پیدا ہوتے ہی کسی مندر کی بھینٹ چڑھا دی جاتی ہے اور وہ رقص و موسیقی سے دیوتاؤں کا دل خوش کرتی ہے جبکہ گزراوقات کے لیے کسی کی داشتہ بن کر رہتی ہے۔ اس میں پدمنی کولہاپوری نے یہ کردار ادا کیا۔

گرودت نے طوائف کی زندگی پر فلم ''پیاسا'' بنائی اور پیاسا کلاسیکل کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس میں طوائف پر ساحرلدھیانوی کی مشہور زمانہ نظم نے تھیم سانگ کی حیثیت حاصل کر لی:

''جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں؟''

ہالی ووڈ کی فلم Blue Angels (بلیو اینجلز) بھی طوائف کے بارے میں تھی کہ کس طرح تھیٹر کی ایک اداکارہ ایک پروفیسر کو اپنے دام محبت میں گرفتار کرتی ہے اور پھر پروفیسر کی تذلیل دکھائی گئی ہے اور اسے اپنے پیشے کی طرف لوٹتے دکھایا گیا ہے۔ اس کی کاپی بھارت اور پاکستان میں شرافت اور پروفیسر کے نام سے فلمائی جا چکی ہے۔

مظفر علی نے ''امراؤ جان ادا'' پر فلم تیار کی۔ امراؤ جان ادا مرزا ہادی رسوا کا مشہور ناول ہے جو 1857ء کے سماج کا احاطہ کرتا ہے کہ کس طرح ایک لڑکی کو اغوا کر کے طوائف بنایا گیا۔

اس طرح سمیتا پاٹل کی فلم ''بازار'' میں ایک نوجوان لڑکی کو طوائف بناتے دکھایا گیا ہے۔ اس فلم کا ایک گیت بڑا مشہور ہوا:

دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے ہی جدا کر چلے

راجندر سنگھ بیدی کی فلم ''دستک'' ایک ایسی فیملی کے بارے میں تھی جسے چکلہ میں کرائے پر مکان ملتا ہے اور لوگ اس کی بیوی کو بھی طوائف سمجھنے لگتے ہیں۔ آخر مجبور ہو کر وہ گیت گاتی ہے:

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

پاکستان میں حسن طارق نے طوائف کے موضوع پر امراؤ جان ادا، انجمن، ثریا بھوپالی جیسی فلمیں تیار کیں۔ ان میں مرکزی کردار اداکارہ رانی نے ادا کیا تھا۔ رانی کو مختار بیگم نے پالا تھا اور تربیت کی تھی جو کبھی لاہور کی ہیرا منڈی میں بیٹھا کرتی تھی اور دار وامرتسری کے نام سے مشہور تھی۔ یہ بڑی طرح دار خاتون تھی۔ مشہور رائٹر چراغ حسن حسرت اور احمد بشیر اس کا گانا سننے باقاعدگی سے جایا کرتے تھے۔ 60ء کی دہائی میں پاکستان میں بھی ''دیوداس'' کے نام سے فلم بنی تھی جس میں اداکار حبیب کے ساتھ شمیم آرا اور نیر سلطانہ نے لاجواب کردار ادا کیا۔ اسی طرح ہدایت کار نخشب جارچوی کی فلموں ''دیا اور طوفان'' (بھارت) اور ''فانوس'' (پاکستان) میں بھی طوائف کے کرداروں پر کھل کر اظہار کیا گیا ہے۔

محمد جاوید فاضل نے ''بازار حسن'' کے نام سے فلم تیار کی جس کی کہانی پرویز کلیم نے لکھی تھی۔ اس فلم کے پروڈیوسر سرور بھٹی تھے۔ بھارت میں اس کی کاپی 'پتی' پتنی اور طوائف کے نام سے تیار ہوئی۔ دونوں فلموں میں سلمیٰ آغا نے طوائف کا کردار کیا۔ ''مجرا'' اور طوائف کا ثانوی سا کردار تو تقریباً ہر فلم میں دکھایا جاتا رہا۔ ممتاز ویسے بھی ہیرا منڈی کی تھی اور جب فلم ضدی میں اس کا مجرا ہوا تو وہ ہٹ ہوگئی اور ہیروئن بن گئی تھی۔ جب تک طوائفیں فلم انڈسٹری میں رہیں فلموں کا معیار بھی بہتر رہا۔ ان کے سیکنڈلز بھی نہیں بنے اور نہ ہی سستا پن آسکا۔ جب سے کال گرلز نے فلموں میں ڈیرا جمایا فلم انڈسٹری برباد ہو کر رہ گئی اور زوال کا شکار ہوگئی۔

لالی ووڈ میں:

پاکستان فلم انڈسٹری میں شروع ہی سے اداکاراؤں اور گلوکاروں کی زیادہ تر اکثریت

طوائفوں کی ہی رہی ہے۔ جب فلموں کا آغاز ہوا تو برصغیر کے لوگ اسے گناہ اور عیب سمجھتے تھے۔ تعلیم کی چونکہ کمی تھی لہٰذا ابلاغ کے اس سب سے بڑے ذریعہ کو شیطانی کام گردانتے ہوئے عام گھروں کی لڑکیاں اور لڑکے ادھر کا رخ کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ لوگ فلموں میں کام کرنا تو دور رہا سینما میں فلم دیکھنے بھی چوری چھپے جاتے تھے اور جن کو فلمیں دیکھنے یا فلموں میں کام کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا تھا وہ بھاگ کر ممبئی پہنچتے تھے۔ ممبئی میں معاشرتی ماحول ذرا آزاد خیال تھا لہٰذا وہاں ان کی یا تو کھپت ہو جاتی تھی یا ناکام ہو کر واپس آجاتے تھے۔ اکثر گھر والوں سے شرمندگی کی وجہ سے فلم انڈسٹری میں ہی سڑتے رہتے تھے وہ یا تو کسی چھوٹے موٹے کام میں جت جاتے تھے یا ایکسٹرا کا کام کرتے تھے۔ اکثر نوجوان بھوک سے تنگ آکر لڑکیوں کی دلالی بھی شروع کر دیتے تھے۔ جوں جوں اس کی اہمیت کا پتہ چلنے لگا تو اچھے گھروں کے لڑکوں نے بھی فلموں میں کام شروع کر دیا۔ ممبئی میں تو اچھے خاندانوں کی لڑکیاں بھی آئیں لیکن زیادہ زور طوائفوں کا ہی رہا کیونکہ اس کے ذریعے انہیں شہرت ملتی تھی اور ان کے دام دوگنے ہو جاتے تھے۔ آج اکیسویں صدی کے اس دور میں بھی پاکستان فلم انڈسٹری میں اچھے خاندانوں کی لڑکیاں آتے ہوئے گھبراتی ہیں۔ وہ ٹی وی پر تو جھک مار لیتی ہیں حالانکہ ٹی وی کا ماحول فلم انڈسٹری سے زیادہ خراب ہے۔ ٹی وی اس کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ یہاں چونکہ اس کے ہر شعبہ میں پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں لہٰذا وہ ہر بُرا کام بھی کسی نہ کسی معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے کرتے ہیں۔ ایک بار مجھے ایک سینئر اداکارہ نے بتایا تھا کہ یہ تو ہمیں پتہ ہے کہ ٹی وی میں کیا ہوتا ہے؟ انگریزی بولنے والی لڑکیاں کچھ کرلیں تو اسے گیٹ ٹو گیدر (Get To Gather) کہتے ہیں اور ہم جیسی کسی کے ساتھ چلی جائیں تو بدنام ہو جاتی ہیں۔

فلم انڈسٹری میں تو جو لڑکی کسی کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرتی ہے وہ اس کے دام بھی کھرے کر لیتی ہے لیکن ٹی وی میں صرف دوستی کی بنیاد پر یا اگلا ڈرامہ دینے کے لالچ میں ہر پروڈیوسر اپنا کام نکال لیتا ہے۔

شو بزنس میں زیادہ تر لڑکیاں کراچی یا ملتان سے آتی ہیں۔ ملتان کی طوائفوں کا رخ زیادہ تر فلموں کی طرف ہی ہوتا ہے لیکن کراچی کی طوائفوں یا اداکاری کی شوقین لڑکیوں نے ٹی وی کو زیادہ ترجیح دی ہے کیونکہ پڑھی لکھی فیملیاں اب اس میں کام کرنا برا خیال نہیں کرتیں۔

فلم انڈسٹری میں آنے والی زیادہ تر لڑکیوں کی کمائی جسم فروشی سے ہوتی ہے۔ ٹی وی کی اداکارائیں بھی اسی ڈگر پر چلتی ہیں۔ انہیں ڈراموں یا فلموں میں اتنے پیسے نہیں ملتے کہ گھر کے اخراجات پورا کر سکیں اس لیے اپنی شہرت کے ذریعے وہ بڑے بڑے سیٹھوں کو پھانسنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح انہیں گھر بھی اچھا مل جاتا ہے اور بھوک بھی مٹ جاتی ہے۔ ایسی عورتوں کو صرف معاشرے کا ڈر ہوتا ہے اسی وجہ سے اپنے اوپر ٹی وی اداکارہ کا لیبل لگا لیتی ہیں تا کہ محلے کے لوگوں میں مشہور ہو کہ ٹی وی میں کام کر کے ان کی گزر اوقات ہوتی ہے۔

طوائفوں کی نشو و نما کے علاقے (کہروڑ پکا)

پنجاب میں طوائفوں کے گڑھ چند بڑے علاقے ہیں جن میں اقبال نگر، لاہور کے قریب پتوکی، اوکاڑہ، ساہیوال کے بعض دیہات اور ملتان کا گڑھ کہروڑ پکا شامل ہے۔ جہاں ان کی پرورش ہوتی ہے ان علاقوں کے بازار حسن سے نامور گلوکارائیں، ڈانسر اور اداکارائیں نکلی ہیں جنہوں نے تھیٹر، ٹیلیویژن، ریڈیو اور فلموں میں دھوم مچائی ان میں سے ان شعبوں میں طبع آزمائی کے لیے تو بہت سی طوائفیں آئیں لیکن نام چند ایک ہی پیدا کر سکیں۔

جنوبی پنجاب چونکہ جاگیرداروں کا گڑھ ہے لہٰذا ان علاقوں میں جاگیرداروں کا دل بہلانے اور ان سے دولت سمیٹنے کے لیے لاتعداد طوائفوں نے اس کو اپنا مسکن بنایا۔ ملتان چونکہ جنوبی پنجاب کا اہم شہر ہے لہٰذا ملتان اور اس کے قریبی علاقے کہروڑ پکا میں طوائفوں کا کافی عروج رہا۔ کہروڑ پکا کے بازار حسن کے بارے میں ایک محقق ڈاکٹر محمد جمیل بھٹی نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جو آپ کی نظر ہے۔

بازار حسن کہروڑ پکا کا آغاز تقریباً 1880ء کے اوائل میں ہوا۔ کہروڑ پکا شہر کے شمال مغرب کی جانب تقریباً ایک کلومیٹر دور ویران اور سنسان جگہ پر خانہ بدوشوں کے ایک گروہ نے آ کر ڈیرے ڈالے ان افراد کی رنگت بالکل سیاہ اور نقش و نگار بھدے تھے۔ لیکن ان کی نوجوان لڑکیوں کے رنگ سانولے لیکن نقش و نگار تیکھے تھے۔ یہ لوگ سارا دن شہر اور گرد و نواح میں بھیک مانگتے اور شام کے وقت کھلی جگہوں پر کرتب دکھاتے۔ جن میں گھڑا ایک لمبے سے بانس

کے ذریعے سر پر رکھنا۔ قلابازیاں کھانا شامل تھے۔ جسمانی کرتب کا بھرپور مظاہرے کرتے اور پھر بھیک مانگ کر گزارہ کرتے۔ جب کہ ان کی خواتین اور نوجوان لڑکیاں ڈھولک بجا کر بھیک مانگتیں اور شادی بیاہ کی تقریبات میں گانے گاتی اور رقص کرتی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ ان لوگوں نے اپنے جھونپڑوں کے پاس ایک میدان صاف کر کے بنالیا اور شام کے وقت یہاں پر تیل مل کر لیمپ کی روشنی میں مرد کرتب دکھاتے اور نوجوان لڑکیاں گانے گاتیں اور رقص پیش کرتیں۔ اس سے ان کو اتنی آمدنی ہونے لگی جتنی وہ سارا دن بھیک مانگ کر بھی اکٹھی نہ کر پاتے تھے۔ نوجوان لڑکیوں کے رقص وسرود کی محفل میں لوگوں کی تعداد آئے روز بڑھنے لگی اور اچھا رقص اور گانا گانے والیوں کو دل کھول کر ''ویلیں'' (نوٹ نچھاور) کی جاتیں۔ اس طرح ان افراد کی آمدنی میں بے انتہا اضافہ ہونے لگا اور پھر کرتب کا مظاہرہ صرف ایک دکھاوا بن کر رہ گیا۔ ساری ساری رات رقص وسرود کی محفلیں جمنے لگیں۔ چند منچلے نوجوانوں نے ان لڑکیوں سے دوستیاں گانٹھ لیں۔ اور دن کے وقت بھی ان کی جھونپڑیوں میں نظر آنے لگے۔ اسی طرح جب ان خانہ بدوشوں کی تیسری نسل آئی تو ان کے رنگ گندمی اور نین نقش خوبصورت بن گئے۔ ان لوگوں نے بھیک مانگنا بند کر دیا اور رقص وسرود کی محفلوں سے مال و دولت اکٹھی کرنے لگے۔ جو طوائف زیادہ خوبصورت ہوتی۔ اس پر علاقہ کے لوگ مال و زر نچھاور کرنے لگے۔ علاقہ کے جاگیرداروں، راجوں، مہاراجوں اور نوابوں نے یہاں پر آنا شروع کر دیا۔ یا اپنی نجی محفلوں میں بلا کر ان سے ''مجرا'' کرواتے۔ مال و زر کی آمد کے ساتھ ہی ان لوگوں نے جھونپڑیوں کو ترک کر کے کفائلی خاندان سے زمینیں خرید کر کچے پکے مکانات تعمیر کر لیے اور اس چھوٹی سی بستی کو ''چکلا'' کا نام دے دیا گیا۔ اس کی گلیاں اور بازار بن گئے۔ جسم فروشی کا دھندا بھی شروع ہو گیا۔ اس دوران رقص وسرود کی محفلیں علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے گھروں میں طوائفیں لگانے لگیں رات بھر ایک علاقہ سے گانے بجانے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ علاقہ کے زمینداروں نے شادی بیاہ اور خوشی کی تقریبات میں ان کو بلانا شروع کر دیا۔ بڑے دن

کے تہوار پر بھی طوائفوں کا مجرا کروایا جاتا اور دوست احباب جاگیرداروں کو دعوت دی جاتی اور خاص اہتمام کیا جاتا۔ کہروڑ پکا شہر اور گردونواح میلسی، وہاڑی، مترو، بہاولپور، ملتان، خیر پور، ٹامیوالی، لودھرا، دنیاپور کے جاگیرداروں میں بازار حسن کہروڑ پکا کی طوائفوں کی دھوم تھی۔ بلکہ بعض جاگیردار تو ان طوائفوں کی زلفوں کے بھی اسیر تھے اور ان کو باقاعدہ رکھیل بنا کر رکھتے اور سرمایہ لٹاتے۔ 1925ء کے اوائل میں کالا عرف کالو کی نوجوان خوبصورت بیٹی زرینہ بیگم عرف زرہ بائی منظر عام پر آئی اور زرہ بائی کے نام سے شہرت حاصل کی۔ زرہ بائی حسن وخوبصورتی کا ایک مجسمہ تھا اور اس کا والد چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں کرتا تھا۔ اس حوالے سے علاقہ میں بدنام تھا۔ علاوہ ازیں بازار حسن میں رہنے اور پیشہ اختیار کرنے کی بنا پر انہوں نے کاروباری گُر اختیار کر لیے تھے۔ زرہ بائی رقص وسرود محفلوں کی جان تصور کی جانے لگی۔ اس کے بغیر محفل میں رنگ نہ جمتا تھا۔ ہر صاحب حیثیت کی خواہش ہوتی تھی کہ زرہ بائی ہی ان کی محفل میں شرکت کرے۔ راجاؤں مہاراجوں کے درباروں تک اس کی شہرت پھیل گئی۔ دور دراز سے اسے گانے اور رقص وسرود کی محفلیں سجانے کے لیے بلوانے کے لیے لوگ آنے لگے۔ قدر و قیمت دیکھی تو اس کے دام بھی بڑھتے گئے۔ خوب دھن دولت اکٹھا کیا۔ علاقہ کے سیاسی خاندان کے ایک بزرگ نے اسے اپنی رکھیل بنا کر رکھ لیا۔ اس کی فرمائش پر ایک خوبصورت محل نما کوٹھی تعمیر کروا دی۔ جو خوبصوتی کے لحاظ سے علاقہ بھر میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔ دو بڑے بڑے ہال کمرے محفل موسیقی اور مجرے کے لیے اور چھوٹے چھوٹے بے شمار کمرے بنائے گئے اور ان کو قیمتی فرنیچر قالینوں اور دیگر قیمتی سامان سے سجایا گیا۔ بعدازاں زرینہ عرف زرہ بائی سے مترو کے ایک جاگیردار صدیق مترو نے باقاعدہ نکاح کیا اور بازار حسن سے دور اپنے علاقہ میں لے گیا وہ عرصہ تک اس کے ساتھ رہی ایک واقعہ نے اس کو دوبارہ اس بازار کی زینت بنا دیا واقعہ کچھ یوں تھا کہ صدیق مترو کی جاگیر میں سینکڑوں کی تعداد میں بھینسیں اور جانور تھے۔ ان کا دودھ دوہنے کے بعد بڑی بڑی گاگروں میں زرہ بائی کے حوالے کر دیا جاتا اور وہ اسے

تقسیم کرتی اور استعمال میں لاتی۔ ایک مرتبہ صدیق مترو کی والدہ نے گیارہویں شریف کے ختم کے لیے دودھ کی گاگریں روک لیں اور باقی زرہ بائی کے پاس بھجوا دیں۔ زرہ بائی نے طیش میں آ کر باقی تمام گاگریں بھی زمین پر الٹ دیں۔ دودھ اتنا زیادہ تھا کہ بہتا ہوا ڈیوڑھی سے صدیق مترو کے ڈیرے میں دوران محفل جا پہنچا۔ جس سے صدیق مترو سخت طیش میں آ گیا اور بندوق اٹھا کر زرہ بائی کو قتل کرنے کی ٹھان لی۔ مگر بعد میں کچھ سوچ کر اسے حکم دیا کہ وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر جو کچھ یہاں سے لے کر جانا چاہتی ہے لے جائے۔ ورنہ اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے گا اور ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ اسے بازار حسن چھوڑ آئے۔ یہ سب کچھ صدیق مترو نے والدہ کی بے حرمتی یا دودھ کی بے حرمتی یا پھر دونوں کی بے حرمتی کے سلسلہ میں کیا۔ اس واقعہ کے بعد زرہ بائی جو گھریلو ماحول کی وجہ سے کافی حد تک بدل گئی تھی۔ اس میں شوہر پرستی بھی آ گئی تھی۔ اس بازار میں دوبارہ دل نہ لگا سکی۔ اس نے متاثر ہو کر ریلوے روڈ پر ایک مسجد تعمیر کروائی جس پر علماء کرام نے فتویٰ دیا کہ ایک طوائف کی کمائی سے مسجد بنائی گئی ہے اور اس میں نماز جائز نہیں۔ زرہ بائی نے دوبارہ علماء سے رابطہ کیا اور موقف اختیار کیا کہ اس نے یہ مسجد اپنے خاوند صدیق مترو کی طرف سے نکاح کے بعد ملنے والے حق مہر سے تعمیر کرائی ہے جو کہ عورت کا حق ہے اور حلال ہے۔ جس پر علماء نے دوبارہ فتویٰ جاری کر کے کہا کہ اگر زرہ بائی نے یہ مسجد حق مہر کی رقم سے تعمیر کروائی ہے تو نماز جائز ہے۔ بعد ازاں زرہ بائی نے باقاعدہ حج ادا کیا اور اکثر اللہ کے نام پر غریبوں میں رقوم تقسیم کرتی تھی۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی اس کے رشتہ داروں نے اس کی تمام جائیداد آپس میں وفات کے بعد تقسیم کر لی۔ اسی دوران ممتاز بائی، نواب بیگم، نجمہ آراء، مختیار بیگم، شمشاد بیگم بھی عروج پر آئیں۔ مگر مختیار بیگم نے سب سے زیادہ عروج حاصل کیا۔ گلوکاری اور ڈانس میں اپنی مہارت کا ثانی نہ رکھتی تھیں اور خوب مال متاع اکٹھا کیا اور زرہ بائی کے بعد اس نے بازار میں محل نما مکان تعمیر کروایا۔ اور اس کی شہرت کے ڈنکے بازار حسن لاہور اور ملتان میں بھی سنے جاتے تھے۔ زرہ بائی نے 110 سال کی عمر میں

وفات پائی۔ قیام پاکستان کے بعد 1950ء میں دیگر طوائفیں بھی منظر عام پر آئیں اور شہرت حاصل کی۔ ان کی شہرت کے آثار بھی اس وقت تک رہے جب تک ان کی جسمانی کشش موجود رہی ان کے بعد کسی نے ان کو پوچھا تک نہیں اور عاشق بھونرے کی طرح اڑ کر دوسرے خوشنما پھول کی تلاش میں رہے۔

1970-71ء میں جماعت اسلامی کے مرکزی رہنما نواب ظفر اللہ خان نے گیلانیوں کے خلاف الیکشن میں حصہ لیا اور اپنی انتخابی مہم میں اپنے مخالف امیدوار کی وہ ویڈیو فلم جلسوں میں دکھائی۔ جب وہ بازار حسن کی طوائفوں کے مجرے میں موجود تھا اور شراب کے نشہ میں دھت دکھایا گیا تھا بعد ازاں نواب ظفر اللہ خان نے ہائیکورٹ میں بازار حسن کو ختم کرنے کے لیے رٹ دائر کی۔ جس میں ہائیکورٹ نے انہیں ایک مخصوص وقت کے لیے ناچ گانے کی اجازت دی۔

1977ء میں مقصود مائی، نجمہ عرف نجو، عذرا، سلامت بی بی، شہناز، طاہرہ، حسینہ، ممتاز بیگم کا دور آیا۔ انہوں نے اس دور میں خوب شہرت اور دولت حاصل کی۔ ان کو ہر محفل کی جان تصور کیا جاتا تھا۔ رقص وسرود کی محفلوں میں بڑی حد تک تبدیلی آئی۔ نئے طریقوں کا عمل دخل ہو گیا۔ اسی دوران علاقہ کی مذہبی جماعتوں کی طرف سے بازار حسن ختم کرنے کے لیے ایک مہم چلائی گئی اس مہم میں بہت حد تک شدت آ گئی۔ پولیس نے ناچ گانے کے علاوہ دیگر دھندے میں سختی شروع کر دی۔ تماشبینوں کی پکڑ دھکڑ بڑھ گئی۔ بعض طوائفوں نے نقل مکانی شروع کر دی۔ ایک موقع پر طوائفوں نے علی الاعلان کہا کہ ہم یہ دھندہ چھوڑنا چاہتی ہیں۔ کیا معاشرے میں کوئی شخص ہمیں عزت دے گا اور ہم سے شادی کرے گا۔ جس پر میلسی، وہاڑی، ٹھٹھہ، کہروڑپکا، دنیاپور، لودھراں اور گردونواح کے زمینداروں کے گروہ نے تقریباً 12 کے قریب طوائفوں سے ایک ہی وقت میں نکاح پڑھوائے۔ ان میں نجمہ عرف نجو، مقصود مائی، خورشید، عذرا بیگم، سلامت بی بی، شہناز بیگم، طاہرہ بیگم، حسینہ بیگم اور ممتاز بیگم اور دیگر شامل تھیں۔ اور یہ

آج بھی اپنے گھروں میں آباد ہیں اور شریفانہ زندگی گزار رہی ہیں۔ علاوہ ازیں بازار حسن کی دیگر طوائفوں شہناز بائی بہارو، شہناز چھوٹی وغیرہ نے شادیاں کیں مگر کامیاب نہ ہوئی اور واپس بازار حسن میں آ کر دھندہ کرنے لگیں۔ اسی اثنا میں بازار حسن تلمبہ سے خیر محمد عرف خیرو، چوہدری مشتاق آ کر آباد ہوئے۔ انہوں نے آ کر بازار حسن کے مکینوں کو منظم کیا۔ کاروبار کے طور طریقے طے کیے۔ اور اسی بنا پر خیرو کو باقاعدہ پنچایت کے ذریعے نمبردار منتخب کیا۔ خیرو نے طوائفوں کو پولیس اور دیگر قانونی پیچیدگیوں میں مدد فراہم کرنے اور تھانہ کچہری کے معاملات سنبھالنے کی یقین دہانی کروائی۔ خیرو نے جو محفلیں ناچ گانے کی ہوتی تھیں میں باقاعدہ نمبردار ٹیکس کے نام سے طوائفوں کی کمائی میں حصہ مقرر کیا۔ جو طوائفیں باقاعدگی سے ادا کرتی تھیں۔ خیرو نے مقامی پولیس سے ملی بھگت کر کے تھانے سے باقاعدہ روانگی درج کروانے کا رواج ڈالا۔ جس کے تحت طوائفیں بازار حسن سے باہر مجرے کے لیے جاتے ہوئے پولیس تھانہ میں خود نمبردار کے ساتھ پیش ہوتیں۔ اپنے شناختی کارڈ ولدیت اور نام وغیرہ درج کرواتیں۔ پولیس ان کو باقاعدہ ایک رسید جاری کرتی۔ جس پر طوائفوں کے ناموں کے ساتھ تھانہ کی مہر اور تاریخ درج کی جاتی اور یہ تمام کارروائی نمبردار کے بغیر پولیس نہ کرتی تھی اور نمبردار باقاعدہ پولیس کو خوش کرتا تھا۔ شناختی کارڈ میں ولدیت کے خانے میں پیسہ کا لفظ لکھوایا۔ یعنی یہ پیسے کی پیداوار ہیں اور اسی کی وجہ سے یہ معرض وجود میں آئے۔ کچھ عرصہ اعتراض کے بعد طوائفوں نے اپنی جائز اولاد کی ولدیت میں اپنے والد اور بھائیوں کے نام لکھوانے شروع کر دیئے جو طریقہ آج تک رائج ہے۔ بازار حسن کہروڑ پکا کو ملتان، بہاولپور، لودھراں، خیر پور، ٹامیوالی، وہاڑی، میلسی، مترو، دنیا پور کے بااثر سیاسی خاندانوں کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ اس بازار سے جنوبی پنجاب کے اکثر وزیروں مشیروں اور اراکین اسمبلی کے رابطے رہے ہیں۔ بازار حسن کے مکینوں نے اس وقت بیوروکریسی میں بڑی حد تک اپنا اثر رسوخ پیدا کر لیا ہے۔ اس لیے ضیاء دور میں بازار حسن کو بدنما داغ قرار دے کر ملیامیٹ کر دیا گیا۔ متعدد کو بند کروا دیا گیا مگر

بازار حسن کہروڑ پکا کے مکینوں کے چاہنے والوں کے اثر و رسوخ کی بنا پر اس پر کوئی حرف نہ آیا اور یہ لوگ اپنے کاروبار کو جاری رکھے ہوئے تھے مگر زور و شور کم تھا۔ ضیاء دور کے اسلامی مارشل لاء میں بھی طوائفوں پر سیاسی اثر و رسوخ کی بنا پر سختی نہ کی گئی تھی۔ بلکہ ایک سابق وفاقی وزیر نے پولیس کو خیرو نمبردار کی شکایت پر ہدایت کی تھی کہ یہ اس کا ننھیال ہے اور ان کو اور تنگ نہ کریں۔ بلکہ ایک اور سابق وفاقی وزیر کے قریبی عزیز نے یہاں پر طوائف سے شادی کر رکھی ہے۔ اور متعدد سابق اراکین اسمبلی مشیروں، وزیروں کے بازار حسن کی طوائفوں سے رابطے تھے۔ 86ء کی جمہوریت کی بحالی کے بعد بازار حسن کہروڑ پکا کو بہت زیادہ عروج حاصل رہا۔ چھوٹے موٹے مکانوں کی جگہ پر کوٹھیاں اور بنگلہ نما مکانات تعمیر ہونا شروع ہو گئے۔ ان کے گھر جدید دور کے تقاضوں کے مطابق فرنیچر قالینوں اور دیگر آرائشی سامان سے سجائے جانے لگے۔ سر شام بڑی بڑی سرکاری اور غیر سرکاری گاڑیوں کا تانتا بندھ جاتا۔ کچھ بازار میں ہی داد عیش دیتے اور بعض اپنے ڈیروں پر لے جاتے۔ بازار حسن کہروڑ پکا کی شہرت لاہور، اسلام آباد، کراچی کے علاوہ ملک کے دیگر بڑے شہروں میں پھیل گئی۔ اس کا شمار ملک کے چند بڑے اور قدیم بازار حسن میں ہونے لگا۔

1987ء میں پولیس تھانہ سٹی کہروڑ پکا کے ایس ایچ او چوہدری محمد علی نے ایک ڈاکٹر کی شکایت پر بازار حسن کو طوائفوں اور تماش بینوں پر چھاپے مارنے اور پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ جس کی وجہ سے اس بازار کا کاروبار مندے کا شکار ہو گیا اور شرفاء نے پولیس کے خوف سے ادھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ بعدازاں خیرو نمبردار نے لاہور ہائیکورٹ میں مسٹر جسٹس منیر کی عدالت میں رٹ پٹیشن نمبر 477-1987ء دائر کی اور عدالت عالیہ نے رات 9 بجے سے طوائفوں کو گانے بجانے کی اجازت دے دی۔

ایک مشہور واقعہ اس دوران پیش آیا کہ کہروڑ پکا کے معروف معالج جو مولوی خاندان سے تھے، نہایت ہی پرہیز گار متقی اور پانچ وقت نماز باقاعدگی سے ادا کرتے تھے۔ بازار حسن کی

طوائفیں اس کے پاس دوائی لینے آتیں تو وہ ان کی نبض چیک نہ کرتے۔ان سے دوائی کی فیس نہ لیتے، دوائی مفت دیتے اور ان کے جانے کے بعد جہاں پہ یہ طوائفیں بیٹھتیں اس جگہ کو پانی سے دھلواتے۔ یہ ان کی نفرت کا عالم تھا۔ مگر بعد میں ان کے دو بیٹوں نے بازار حسن کی طوائفوں سے ہی شادی کی۔ جوان کے لڑکوں کے بچوں کی مائیں بنیں اور اپنے گھروں میں خوش وخرم آباد ہیں۔

بازار حسن کہروڑ پکا میں طوائفوں نے بھی وقت کے ساتھ ساتھ خود میں تبدیلیاں کیں اور آنے والے تماش بینوں کو لوٹنے کے لیے نت نئے طریقے اختیار کیے۔ نئے دور کے مطابق گلوکاری، رقص کی تربیت لی، اس دوران طوائفوں رانی ملک، الماس عرف مون، گلبہار بانو، کشور، غزالہ، نادیہ، زیب سیال، شہزادی کالی، صوبیہ عرف ببلی، صنوبر، کوثر بھٹی منظر عام پر آئیں۔ گلبہار بانو نے گلوکاری میں شہرت حاصل کی۔ ریڈیو پر سرائیکی گیت گا کر ٹیلی ویژن، سٹیج پر اپنے لیے جگہ بنائی اس وقت اس کا شمار لوک گیت گانے والے اچھے گلوکاروں میں ہوتا ہے۔ آج بھی ریڈیو پر ان کے گانوں کو فرمائش کر کے سنا جاتا ہے۔

لالا ممتاز، بانو، بھارو، سندین، نذیر، سائرہ، بدرو، روبینہ، سعیدہ نے گلوکاری اور رقص میں کافی شہرت حاصل کی ان کی تین آڈیو کیسٹس اب تک مارکیٹ میں آ چکی ہیں۔ انہوں نے سٹیج، ریڈیو پر لوک گیت گا کر اپنا نام پیدا کیا۔ جبکہ الماس عرف مون نے کئی فلموں میں اداکاری کی، زیب سیال، فوزیہ، حسینہ جو اب لاہور میں منتقل ہوگئی ہیں اور فلموں میں کام کرتی ہیں جبکہ موجودہ دور میں شہلا، ارم، نادرہ، صنم ناز، چندہ سحرش مطلوب، صائمہ، نذرانہ، ریحانہ، مونا، انمول سیال، چندہ سیال، فہمیدہ سیال، صوبیہ خان، صائمہ جہاں، سونیا، سمیرا کنول، ستارہ عرف بی، فوزیہ کو سٹیج آرٹ اداکاری گلوکاری اور رقص میں کافی شہرت حاصل ہے، بازار حسن کی طوائفوں کی اکثریت ملتان، لاہور، کراچی، اسلام آباد، مری جیسے شہروں میں مندے کے رجحان کی وجہ سے شفٹ ہوگئی ہے اور کچھ زیادہ دولت حاصل کرنے کے چکر میں فلم سٹیج اور ٹیلی

ویژن میں اداکاری وگلوکاری کے لیے چانس لینے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہی ہیں۔

بازار حسن میں خیرو کی نمبرداری اب کئی حصوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ دس بارہ گھروں نے اپنا ایک نمبردار بنالیا ہے۔ جو ان گھروں کے تمام مسائل حل کرواتا ہے۔ ان افراد نے تھانہ کچہری میں اپنا اثر ورسوخ پیدا کرلیا ہے ان نمبرداروں میں سعید، محمد علی، جاوید ڈڈ، پھتی، اعجاز، مٹھو، طالب، ربنواز، امیر بخش شامل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اثر ورسوخ کے حوالے سے خیرو اب ہیڈ نمبردار اور سعید سینئر نمبردار کہلاتا ہے۔

کسی بھی معاشرے میں رہنے والے افراد نے اپنی زندگی گزارنے کے کچھ طریقے طے کر رکھے ہوتے ہیں جن کے اندر رہ کر وہ اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ اسی طرح بازار حسن کہروڑ پکا کے مکینوں نے بھی اپنے اوپر کچھ اصول لاگو کر رکھے ہیں۔ جن پر سختی سے عمل درآمد کرتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنے پر مرتکب افراد کو پنچایت میں سزا دیتے ہیں۔ ان اصولوں میں پہلا اصول یہ ہے کہ بازار حسن کے مکین اپنے لڑکوں کی شادیاں طوائفوں سے نہیں کرتے بلکہ اپنے خانہ بدوش قبیلہ (جو اب بھی بھیک مانگتے ہیں) میں کرتے ہیں۔ اور لڑکی کی بھاری قیمت ادا کرتے ہیں اور پھر ان لڑکیوں کو بازار حسن کے دھندہ سے دور رکھتے ہیں اور اسے اپنی عزت متصور کرتے ہیں۔ اس لڑکی سے پیدا ہونے والی اولاد یعنی لڑکیوں سے یہ دھندہ کروایا جاتا ہے۔ ایک موقع پر ہیڈ نمبردار خیرو نے کہا تھا کہ یہ دھندہ کرنے والی طوائفیں ان ہی زمینداروں کی اولاد ہیں اور ان کے پاس ان زمینداروں کی ہی اولادیں آتی ہیں۔

طوائف بازار حسن کے کسی کنجر سے کسی قسم کا تعلق جنسی وجسمانی نہیں رکھ سکتی۔ اگر ایسا کیا اور وہ پکڑا گیا تو اسے سخت سزائیں اور جرمانے کیے جاتے ہیں۔ جیسے قبائلی علاقوں میں ہوتے ہیں۔

فوتگی کی صورت میں تمام گھر چندہ اکٹھا کر کے کفن ودفن اور دیگر رسوم ادا کرتے ہیں یہ سب پر لاگو ہے۔

طوائف کی شادی یا رکھیل کی صورت میں آنے والے شخص کا خاندانی پس منظر اور حسب نسب اور جائیداد وغیرہ کو دیکھا جاتا ہے۔ مگر اب ایسا نہیں ہوتا اب صرف دولت کو ترجیح دی جاتی ہے۔

بازار حسن کہروڑ پکا میں بہت سے جاگیرداروں کے عروج و زوال کی داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔ جو اپنی جاگیروں دھن دولت سب کچھ لٹا کر اس بازار سے نکلے کہ پھر واپس ادھر کا رخ نہ کیا۔

پولیس تھانہ سٹی کہروڑ پکا کے SHO چوہدری غلام محی الدین سے رابطہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ بازار حسن کی طوائفوں کی تھانہ میں پروگرام پر جاتے ہوئے کوئی انٹری نہیں کی جاتی۔ اور نہ ہی اس کی کوئی قانونی حیثیت ہے بلکہ تھانے میں آ کر یہ لوگ اطلاع دے جاتے ہیں کہ فلاں جگہ پر پروگرام کرنے جا رہے ہیں اور تھانہ کی مہر سے ایک چٹ بنا کر دے دی جاتی ہے جو راستے میں کسی پولیس موبائل کے ملنے پر دکھا کر آسانی سے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی نقل و حرکت کے بارے میں بھی آگاہی رہتی ہے اور کسی وقوعہ کے سلسلہ میں فوری معلومات مل جاتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ناچ گانے کی ان کو ہائیکورٹ نے اجازت دے رکھی ہے اور جسم فروشی کا دھندہ خلاف قانون ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ان کے خلاف اکثر کاروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ انٹری درج کرانے سے ان کو کسی قسم کا تحفظ حاصل نہ ہے۔

(بشکریہ ڈاکٹر محمد جمیل بھٹی)

نشاط روڈ ملتان

ملتان میں جس جگہ بازار حسن واقع ہے اسے نشاط روڈ کہا جاتا ہے۔ عام لوگ اسے چکلہ بھی کہتے ہیں اور ہیرا منڈی بھی۔ اس بازار میں رہنے والیوں کے گھر بڑے بڑے بھی ہیں اور چھوٹے بھی ہیں، پختہ بھی ہیں اور کچے مکان بھی۔ بعض مکان ایک کمرے پر ہی مشتمل ہیں یہیں وہ اپنا کام کرتی ہیں اور رہائش بھی رکھے ہوئے ہیں۔ یہ طوائفیں اپنے کام میں کافی محنتی بھی ہیں لیکن لوگ انہیں مختلف ناموں سے پکارتے ہیں جن میں طوائف، کنجری، رقاصہ، رکھیل، ناکا، رنڈی، کال گرل، ٹیکسی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جو گناہ کے کاروبار کو روزی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان میں گانے والیاں بھی ہیں ایک مینا لودھی ہوتی تھی جو اچھی گلوکاری تھی اور خوبصورت بھی تھی۔ اقبال بانو بھی خوش شکل اور کمال کی سنگر تھی۔ مینا لودھی کا گھر کافی اچھا تھا اس کا باپ عطا محمد تھا جبکہ بھائی شمیم حسین تھا اس نے اپنی بہن اور ماں سے کبھی ایک روپیہ بھی نہیں لیا۔ اس نے سکول میں داخلہ لیا تو چھوٹی کلاس کے لڑکوں کو ٹیوشن پڑھاتا تھا اور اسی سے اپنے اخراجات پورے کرتا تھا۔ اس نے جب ماسٹر کیا تو کسی نے اسے مقابلہ کے امتحان میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ اس نے مطالعہ شروع کیا ایک روز وہ نہانے کے لیے حمام پر گیا تو کسی نے اس سے اس کی بہن کے بارے میں پوچھا۔ اسے بڑی تکلیف ہوئی۔ وہ گرم گرم نہا کر نکلا تھا باہر سردی تھی۔ اسے تیز بخار چڑھا اور صبح وہ راہی ملک عدم ہو گیا۔

ان دنوں طوائفیں زیادہ تر خواجہ فرید کا کلام گاتی تھیں۔ ان میں ایک بدرو بائی بھی تھی اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے مینا لودھی بھی تھی۔ مینا لودھی بے حد خوبصورت تھی وہ ریڈیو پر

گاتی تھی اور وہاں کے لوگ اس کی آواز سے زیادہ اس کی خوبصورتی کی تعریف کرتے تھے اس کی ماں بھی تھیٹر میں کام کرتی رہی تھی۔ پھر بینا نے ایک رجسٹری کلرک سے شادی کر لی لیکن طلاق لے لی اس کے بعد ملتان کے ایک سرمایہ دار ٹھیکیدار سے شادی کی جس نے اسے شراب کی لت ڈال دی ایک روز وہ شراب پی رہی تھی کہ بوتل ختم ہونے سے قبل ہی خود ختم ہو گئی۔

اقبال بانو بھی ملتان کی تھی اسے انور کمال پاشا کی فلم ”قاتل“ کے اس گیت سے شہرت حاصل ہوئی۔

دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

الفت کی نئی منزل کو چلا
تو ڈال کے باہیں باہوں میں

قتیل شفائی سے اس کی داستان محبت مشہور ہوئی پھر وہ ملتان سے لاہور چلی گئی اور وہی رہیں وہیں دفن بھی ہوئی۔

ملتان ہیرامنڈی میں ایک ماسٹر خادم حسین بھی ہوتے تھے اچھے ہوشیار تھے۔ ہارمونیم بجاتے تھے۔ ان کی ایک بہن نگینہ بھی تھی جو بہت اچھا گاتی تھی ان کے سامنے ریما کی ماں سیاں کا چوبارہ تھا۔ اس کے ایک اور بیٹی مختار بھی تھی اس کی بیٹی زینت تھی وہ نور جہاں کے گیت گاتی تھی اس کی بڑی خواہش تھی کہ میں گلوکارہ بنوں لیکن وہ کچھ بھی نہ بن سکی طوائف ہی رہی۔ اوپر ذکر نگینہ کا کیا جا چکا ہے جس کو سب لوگ لکی کہتے تھے کیوں کہ وہ انگریزوں کی طرح بھورے رنگ کی تھی۔ اس نے ایک نواب سے شادی کر لی تھی اور خود بھی نواب لکی بن گئی تھی۔

حیدر باندی نامی طوائف کا تعلق بھی لودھی گھرانے سے تھا۔ وہ بھی بہت اچھا گاتی تھی ایک بار مجرا کرنے نواب بہاولپور کے محل میں گئی تو وہیں کی ہو رہی کیونکہ نواب صاحب نے کہا تھا کہ یہیں اپنا ٹھکانا بنا لو۔ اس کی خوبصورتی کے چرچے تھے اس پر ایک شاعر نے قطعہ بھی لکھا تھا:

واہ مکھڑا حیدر باندی دا
جیویں چند چڑھیا چاندی دا

ملتان والے اس کا احترام سے ذکر کرتے ہیں۔ محل میں جانے کے باوجود اس نے گانا نہیں چھوڑا تھا۔ اس طرح اس کو ایک شاگرد ملی جو خوبصورت بھی تھی اور غزل بھی اچھی گاتی تھی اس کا نام ثریا ملتانیکر تھا اس کے استاد غلام نبی تھے۔ اس نے ایک ٹھیکیدار سے شادی کر لی تھی پیلو پکیاں خواجہ فرید کی کافی بڑے اچھے ڈھنگ سے گاتی تھی۔ پھر اس نے مسرور انور کا یہ گیت گایا:

بڑے بے وفا ہیں یہ حسن والے
ان سے دل لگانے کی کوشش نہ کرنا

یہ گیت کافی مشہور ہوا۔ اس گیت کی کمپوزیشن ارشد حسین نے کی تھی جو ماسٹر عنایت حسین کے بھائی تھے۔

ایک اور طوائف ہوتی تھی جس کا نام مسرت بانو تھا لیکن ناٹے قد کی وجہ سے سب ہی اسے مسرت ٹھنگی کہتے تھے یہ بھی اچھا گاتی تھی۔ ملتان ریڈیو پر جتنے بھی سنگر تھے جن میں اقبال بانو، ثریا ملتانیکر اور دلدار بلوچ قابل ذکر تھے چوتھے نمبر پر مسرت ٹھنگی تھی جو مقبول بھی تھی اور قبول صورت بھی۔ وہ جب گانا گاتی تھی تو ہفتہ میں صرف ایک بار وہ بھی تین گھنٹے کے لیے اور منتخب ہی سننے والے اس کی محفل میں آتے تھے۔ انہیں بھی جوتا اتار کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ اس کے گانے کی تعریف بھی کرتے تھے اس کا انجام اچھا نہیں ہوا لیکن اس کی شاگرد ناہید اختر نے خوب نام کمایا آخر میں شادی کر کے اس نے گانا ہی چھوڑ دیا۔ ناہید اختر اس کی بھتیجی بھی ہے۔

ملتان میں آ کر بہاولپور سے ایک اور طوائف آباد ہوئی اس کو سب ہی نذیراں بہاولپور والی کہتے تھے۔ اس نے ملتان میں ڈیرا بنایا۔ اس کی دو بیٹیاں انجم (انجمن) اور گوری تھیں۔ ان کا ڈیرا چوک شہیداں کے قریب تھا۔ انجم نے لاہور جا کر شباب کیرانوی کی فلم زنجیر میں کام کیا تو اس کا نام انجمن رکھ دیا گیا۔ گوری نے بھی چند ایک فلموں میں کام کیا لیکن جتنا عروج انجمن کو ملا کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ جب انجمن کا تعلق ایک بڑی شخصیت کے ساتھ ہو گیا۔ وہ لاہور آ کر

گلبرگ میں رہنے لگی۔ ادھر ملتان میں ان کی کرائے دار سیاں تھی جو کہ ریما کی والدہ ہے ان کا مکان کے سلسلہ میں جھگڑا ہوا تو قیصر ملک نے اس کو حل کیا اور ریما خان کی والدہ سے کہا کہ تم تین ماہ اور رہ لو اس کے بعد یہ گھر خالی کر دینا۔ اس کا کرایہ بھی چاہے نہ دینا لیکن ریما کی والدہ نے 20 روز بعد ہی گھر خالی کر دیا کیونکہ ریما بھی اپنی پہلی فلم بلندی کے ہٹ ہونے کے بعد مقبول ہیروئن بن گئی تھی پھر اس نے لاہور میں انجمن سے بڑی کوٹھی خریدی۔

ترنم ناز کا تعلق بھی ملتان سے ہے۔ وہ ریڈیو پر گاتی تھی بعد ازاں لاہور ٹی وی سے گاتی رہی۔ اس کی آواز نور جہاں سے ملتی تھی اور وہ زیادہ تر گیت نور جہاں کے ہی گاتی رہی۔ پھر وہ نور جہاں کی شاگرد ہو گئی اور اس نے شاگرد بننے کے پچاس ہزار روپے نور جہاں کو دیئے تھے اور اس کے بعد وہ ہمیشہ نور جہاں کے گیت ہی گاتی رہی۔

گانے والیوں کے علاوہ کسبیاں بھی تھیں جن میں مختاری نیلو بہت اچھی ڈانسر تھی اس کے گھر کے آگے مجمع ہی لگا رہتا تھا۔ ایک روشن آرا تھی وہ کھری اور سچی عورت تھی۔ لاہور سے جو بھی پہلوان جاتا اس کے پاس ٹھہرتا خود بھی پہلوان ٹائپ کی تھی۔ ملتان کی بہت سی طوائفیں کوٹھوں سے نکل کر کوٹھیوں میں آ گئیں۔ شکیلہ قریشی نے ڈرامہ ''پیاس'' سے شہرت حاصل کی اور پھر عمر شریف سے شادی کرنے اور طلاق کے بعد گمنام ہو گئی۔ نسیم اختر اہل زبان تھی گلوکاری میں اس کا بھی جواب نہیں تھا۔ ایک کوثر پروین تھی شکل واجبی سی لیکن گاتی بہت اچھا تھی ایک بار عزیز میاں قوال ملتان آئے تو انہوں نے اس کا گانا سنا اور پھر سنا ہے کہ دونوں اکٹھے گانے لگے تھے۔ رخسانہ ملتانی نے لاہور جا کر فلموں میں بھی کام کیا لیکن پھر کسی سے دوستی لگا کر فلم انڈسٹری چھوڑ دی اس کا بھی انجام اچھا نہیں ہوا۔ اور بھی لڑکیاں تھیں لیکن اب تو ہر شہر میں بازار حسن نام کا ہی رہ گیا ہے جب کہ یہ کام محلوں اور پوش علاقوں تک پھیل چکا ہے۔

(قیصر ملک، ملتان)

ملتانی اداکارائیں

ملتان ایک زمانے میں گرد، گرما اور گورستان کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا مگر جدید زمانے میں اس کی شہرت کا سبب دو نئے حوالے بھی بن گئے ہیں۔ ان میں ایک ملتانی سوہن حلوہ اور دوسرا ملتان کی وہ نامور اداکارائیں ہیں جن کا تعلق اس شہر کے گلی محلوں سے رہا ہے لیکن آج وہ خود کو بڑے بڑے خاندانوں کی بیٹیاں کہہ کر متعارف کراتی ہیں اور ان گلی محلوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں جہاں انہوں نے بچپن اور گمنامی کے دن گزارے۔

ملتان سے جن اداکاراؤں نے لاہور منتقل ہو کر ملک گیر شہرت حاصل کی ان میں انجمن، گوری، ریما، کنول، سائرہ خان، صائمہ، شکیلہ قریشی، تانی بیگم، ثناء اور گلوکارہ ناہید اختر شامل ہیں۔ آج یہ تمام اداکارائیں اور گلوکارائیں لاہور کے ''پوش'' علاقوں میں بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتی ہیں۔ بڑی بڑی گاڑیوں کی مالک ہیں لیکن ان کے عزیز و اقارب ملتان میں عسرت اور محرومی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ آج بھی انہی چھوٹی اور گندی گلیوں کے تنگ مکانوں میں رہتے ہیں جہاں سے اٹھ کر ان اداکاراؤں نے شہرت اور مقبولیت حاصل کی لیکن اس شہرت اور مقبولیت کو اپنے رشتہ داروں کی زندگی بدلنے اور تنگ گلیوں کو سنوارنے کے لیے استعمال نہیں کیا جبکہ ملتان چھوڑنے کے بعد لاہور میں بطور اداکارہ کامیاب ہونے پر صرف چند سالوں میں لاکھوں بلکہ کروڑوں پتی ہو گئیں اور ان کے ناچ گانے کا وہ فن جو انہیں ورثے میں ملا تھا، جب پردہ سکرین پر منتقل ہوا تو ان کے لیے ایک ایسی ''مرغی'' بن گیا کہ جو روزانہ درجنوں سونے کے انڈے دیتی ہے۔ ملتان میں حرم گیٹ کے علاقے نشاط روڈ پر واقعی بازار حسن کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ آج یہاں ماضی جیسی رونقیں تو نہیں ہیں لیکن پھر بھی رات ہوتی ہے تو

طبلے اور سارنگی کے ہمراہ پائل چھنکتی ہے اور نوٹوں کی بارش ہوتی ہے۔

اس علاقے سے بہت سی اداکاراؤں اور گلوکاراؤں نے جنم لیا جو بعد میں فلم انڈسٹری کے ذریعے ملک کی بڑی اداکارائیں کہلائیں۔ ان میں سب سے معروف نام انجمن کا ہے۔ انجمن کی پیدائش سے قبل نذیراں بیگم کے 3 بیٹے تھے جو ظاہر ہے کہ ''والدین'' کے لیے بیکار تھے۔ انجمن کی پیدائش بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد ہوئی۔ اس کے پیدا ہونے پر جشن منایا گیا۔ اس کا نام انجم آرا رکھا گیا۔ ان کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ یہ فیملی 1955ء میں احمد پور شرقیہ سے نقل مکانی کر کے ملتان پہنچی۔ یہ قافلہ فیض علی خان (انجمن کے والد)، لالاں بی بی (نانی)، حیات اللہ خان (نانا) اور امجد علی، ارشد علی، ناصر علی (بھائی) پر مشتمل تھا۔

انجمن کی فیملی نے چوک شہیداں سے سٹی سٹیشن کی جانب واقع نویں بھنوویں وسال شاہ میں مکان خریدا اور اپنے خاندان کو ''مخدوم'' مشہور کیا لیکن ''مخدومی'' کا یہ ڈرامہ زیادہ دیر تک رچایا نہ جا سکا کیونکہ جلد ہی ان کے مکان پر گھنگھروؤں اور طبلوں کی آوازوں نے ان کی ''مخدومی'' کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ انجمن کی پیدائش کے 2 سال بعد بھی یہ کام جاری رہا۔ پھر انجمن کو سکول میں داخل کرایا گیا اور پرائمری کے بعد اس نے اسلامیہ گرلز ہائی سکول میں داخلہ لے لیا۔ وہ بچپن سے ہی بڑے اکھڑ مزاج کی مشہور تھی اور لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا، کنچے وغیرہ کھیلتی تھی۔

فلم انڈسٹری میں جانے سے قبل بہت عرصے تک گوری مجرے کرتی تھی۔ کچھ عرصہ قبل تو وہ ملتان کے معروف صنعتکار کے گھر مجرا کرتے ہوئے پکڑی بھی گئی تھی۔ انجمن، گوری کے پرانے گھر کے قریب بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر شخص سے جب میں نے انجمن کی والدہ کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ ''اس کا نام نذیراں بائی تھا'' اور جب میں نے یہ پوچھا کہ باپ کا کیا نام تھا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور کہا کہ ''ان کے باپ کا نام پوچھنا ایک بہت بڑی گالی ہے۔ آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔''

آج کی مشہور اداکارہ ریما کی والدہ سیاں نے بازار حسن میں رہنے کے باوجود ملتان کے وڈیرے سے شادی کی جس کا تعلق ملتان کے نواحی قصبے ٹاٹے پور سے ہے۔ انہوں نے انکم ٹیکس آفیسر کی حیثیت سے عرصہ دراز تک سرکاری ملازمت بھی کی ہے۔ سیاں چودھری سے ان کی

دوسری شادی تھی۔ وہ سیاں چودھری کا گانا سننے کے لیے بازار حسن جاتے تھے۔ اس دوران انہیں سیاں بھا گئی اور انہوں نے خاندان کی سخت مخالفت کے باوجود اس سے شادی کر لی۔

سیاں کے بطن سے 4 بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ریما کا نمبر دوسرا ہے۔ بعد ازاں ان میں علیحدگی ہو گئی۔ ریما کی بڑی بہن نے مرضی کی شادی کر لی تھی جس سے ایک بیٹا پیدا ہوا مگر اس کی شوہر سے نہ بن سکی اور ان میں علیحدگی ہو گئی۔ وہ بیٹا آج کل سیاں کے پاس ہے اور اس نے اسے اپنا بیٹا مشہور کیا ہوا ہے۔

پھر ریما کی بہن نے دوسری شادی کر لی۔ ریما کے والد آغا اکمل قزلباش نے تیسری شادی ٹیلیویژن کی معروف اداکارہ عصمت طاہرہ سے کی مگر پھر اس سے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔

سیاں چودھری تیمور روڈ چوک شہیداں ملتان کے بازار حسن میں انجمن کے قریب رہا کرتی تھی۔ ریما اور اس کی بہنوں نے یہیں پر اپنا بچپن گزارا اور اسی جگہ پہلی بار گھنگھرو باندھ کر ڈانس کی تربیت حاصل کی۔ محلے داروں کے مطابق ریما دوسری بہنوں کی نسبت کم گو اور شرمیلی تھی۔ ریما نے اپنے والد کو چوک نواں شہر کے قریب ایک کمرشل پلازہ بھی بنا کر دے رکھا ہے جو شہر بھر میں ''ریما پلازہ'' کے نام سے معروف ہے۔ ریما نے پلازہ کے قریب شاندار کوٹھی بھی بنا کر دے رکھی ہے اور جب کبھی ریما ملتان آتی ہے تو اسی کوٹھی پر قیام کرتی ہے۔

انجمن اور ریما کی ماؤں کا پھڈا

اداکارہ ریما کی والدہ سیاں چودھری جو ''چھیماں'' کے نام سے مشہور تھی، اداکارہ انجمن کی والدہ نذیراں بیگم کے پڑوس میں رہتی تھی اور ان کے درمیان اس قدر دوستی تھی کہ دونوں سگی بہنیں کہلاتی تھیں لیکن 1968ء میں اس وقت ایک دوسرے کی جانی دشمن بن گئیں جب نشاط روڈ پر واقع مکان کی خرید و فروخت کا معاملہ عدالت تک جا پہنچا۔ ان دونوں کے درمیان حق شفع کا کیس 14 برس تک سول کورٹ سے سیشن کورٹ تک چلا۔ بالآخر 82ء میں انجمن کی والدہ یہ کیس جیت گئی اور ریما کی والدہ دلبرداشتہ ہو کر ملتان

چھوڑ کر لاہور چلی گئی۔ بتایا جاتا ہے کہ پہلے سول کورٹ سے کیس ریما کی والدہ نے جیتا تھا لیکن پھر انجمن کی والدہ نے سیشن کورٹ میں دعویٰ کیا اور فیصلہ اس کے حق میں ہوگیا۔ ریما کی والدہ ہائیکورٹ میں جانا چاہتی تھی لیکن یہاں پر انجمن کی والدہ نے ریما کی والدہ کو ''چکر'' دیا اور ''مذاکرات'' شروع کر دیئے۔ یوں کچھ عرصہ گزر گیا اور ہائیکورٹ تک پہنچنے میں تاخیر ہوگئی۔ یعنی مقدمہ آگے دائر کرنے کا وقت گزر گیا۔

اداکارہ سائرہ خان ملوک بی بی عرف بنتو کی بیٹی ہے، جس کا آج بھی ممتاز آباد محلہ اسلام پورہ میں اڑھائی مرلے کا مکان ہے۔ پہلے شوہر سے طلاق کے بعد سائرہ کی والدہ نے دوسرا نکاح کرلیا۔ سائرہ خان نے پانچویں جماعت ممتاز آباد کے آئیڈیل پبلک سکول میں پڑھی۔ پھر خورشید ماڈل سکول میں داخل ہوئی، جہاں سے اسے نکال دیا گیا۔ پھر اس نے سلطان فاؤنڈیشن گرلز ہائی سکول میں داخلہ لے لیا۔

سائرہ خان بچپن سے ہی شوخ وچنچل طبیعت کی مالک تھی اور انہی حرکتوں کی وجہ سے جب وہ میٹرک میں پہنچی تو لڑکوں میں خاصی شہرت رکھتی تھی اور اس کا نام لڑکوں کی زبان پر عام تھا۔ انہی حرکات کی بنا پر سلطان فاؤنڈیشن سکول سے یہ کہہ کر اس کا نام خارج کر دیا کہ اس کی وجہ سے سکول کا ماحول خراب ہو رہا ہے۔

پرائیویٹ طور پر میٹرک کرنے کے بعد اس نے گورنمنٹ خواتین کالج میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا۔ فلموں اور ٹی وی پر کام کرنے کے جنون نے ایف اے بھی پاس نہ کرنے دیا۔ سائرہ خان اپنی ماں کے پہلے شوہر کی اولاد ہے۔ اس کے 2 بھائی اور ایک بہن اور بھی ہیں۔ سائرہ خان لاہور جانے سے پہلے ملتان میں لیڈی ویڈیو آپریٹر کے طور پر بھی کام کرتی رہی ہے، جس کا اس کو ڈیڑھ سو روپے فی فلم معاوضہ ملتا تھا۔ سائرہ کی انتہائی قریبی دوست نے بتایا کہ اس کو بچپن سے ہی ماڈل بننے اور فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا۔

(رپورٹ: آغا محمد علی)

✿

بازارِ حسن، حیدرآباد

یہ 1969-70ء کا حیدرآباد ہے۔ ایک اچھوتا سمٹا ہوا سرمائی شاموں اور مشکبار ہواؤں کا شہر۔ امن شانتی اور محبتوں کے پھیلاؤ کا شہر۔ لہجوں، سوچوں اور فکروں سے پیار کی خوشبو مہکاتا شہر۔ یہاں بالائی حصے کے وسط میں قدیم ہندو چماروں کی آبادی کا علاقہ مٹرپچی محلہ موجود ہے جسے عرف عام میں ''بازارِ حسن'' کہا جاتا ہے یہ بازار شہر کے امرا، روسا اور نو دولتیوں کے جمالیاتی ذوق کے لیے ایک زرخیز منڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنی بناوٹ، کشادگی اور ترتیب کے اعتبار سے بھی پاکستان بھر میں قائم اس نوعیت کے دیگر بازاروں کے مقابلے میں اس بازار کو نمایاں مقام حاصل ہے اور کیوں نہ ہو کہ یہ بازار اپنی پوری رعنائیوں، شادابیوں اور جوبن کے ساتھ آباد ہے۔

دن بھر کا تھکا ماندہ سورج جیسے ہی غروب ہوتا۔ تب یہاں ہر کوٹھے کے سامنے چھڑکاؤ شروع ہو جاتا ہے۔ قرب وجوار کے چھوٹے ہوٹل اور پان کے کیبن کھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ کوٹھوں پر اجلی دریاں، شفاف چاندنیاں اور گاؤ تکیے لگنے لگتے ہیں۔ اگر بتیوں کی خوشبو سے در و دیوار مہکتے، رات جیسے ہی اپنی زلفیں بکھیرتی ہے تماش بینوں کی ٹولیاں بازار میں آنے لگتی، ایک رکھ رکھاؤ اور سلیقے کے ساتھ ہارمونیم، ڈھولک اور سازندوں کی ہمراہی میں رقاصائیں تماشائیوں کے سامنے اعضا کی شاعری شروع کرتی، ہچکولے لیتے یہ بدن تماشائیوں کو دیوانہ بناتے۔ یہ سلسلہ ایک مخصوص وقت تک جاری رہتا۔ بعدازاں رات 12 بجے پولیس کی جانب

سے بجنے والی سیٹیاں اس بات کا اعلان کرتی کہ مجرے کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ یوں کوٹھوں کی بتیاں گل ہونا شروع ہوتی۔ رقاصائیں پاؤں سے بندھے گھنگرو کھولنا شروع کرتی اور تماشائی خالی جیبوں گھروں کو لوٹنا شروع ہوتے۔ اب بھی سا رے۔۔ گا ما۔۔ پا۔۔ دھا نی۔۔ سا۔۔ کے سلسلے میں جہاں سے شروع ہوئے تھے وہیں ختم ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں پنجاب کا بٹوارا ہونے کے بعد اپنے دور کی نامور اور ممتاز طوائفوں نے جہاں اس بازار کو اپنا مسکن بنایا وہیں ہجرت کے ذریعے لکھنؤ، آگرہ، دہلی، علی گڑھ، بہار، جے پور، کانگڑ اور باون گڑھ کی مشہور ڈیرے دارنیاں بھی اس بازار میں آ کر آباد ہوئیں جس کے سبب ان کوٹھوں پر ایک مخصوص تہذیبی روایت دکھائی دیتی تھی، ایک ایسی روایت جس نے اپنے عہد کی انتہائی معزز اور قابل احترام شخصیات کو بھی ان کوٹھوں کے طواف پر مجبور کر دیا تھا۔

گلشن کا یہ کاروبار اپنی پوری سج دھج کے ساتھ جاری تھا کہ 22 نومبر 1974ء کو بالکل اچانک غیر متوقع طور پر شہر کے ایک ایس ایس پی کی ہمراہی میں پولیس کی بہت بڑی نفری نے شام کے وقت اس بازار کی آبادی کو محاصرے میں لے لیا۔ چار گھنٹے کی خطرناک ناکہ بندی کے دوران پولیس نے رقص و گیت کے پیشے سے وابستہ مجرا کرنے والی سینکڑوں طوائفوں کو گرفتار کر لیا۔ اس چھاپے کے دوران بیشتر کو پیشہ ور مجرموں کی طرح گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے پولیس کی گاڑیوں میں ڈالا گیا۔ دوسری صبح کے اخبارات کے مطابق ان طوائفوں پر ناچ گانے کی آڑ میں عصمت فروشی کے علاوہ جرائم پیشہ افراد سے تعلقات کا بھی الزام تھا۔ خبر کے مطابق ایس ایس پی صاحب جب اپنے نادر شاہی احکام کو دہرا رہے تھے اس وقت ان سے یہ پوچھنے والا کوئی نہ تھا کہ جناب کس قانون اور ضابطے کے تحت آپ طوائفوں کو محلہ چھوڑنے اور ضلع کی حدود سے نکل جانے کا حکم دے رہے ہیں؟

یہ بات قانون کی کس کتاب میں موجود ہے؟ یا پھر اور شہروں کی نسبت اس وقت کے ایس ایس پی حیدر آباد زیادہ ہی اختیارات کے مالک تھے یا ان کا دماغ خراب تھا جو محض

ڈنڈے کے زور پر شہر کو طوائفوں سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ زیادہ سختی کرنے سے یہ لعنت ایک بازار سے نکل کر مختلف بازاروں اور محلوں میں پھیلے گی۔ پھر وہاں طوائفوں کے شیدائی شریف عورتوں کی زندگیاں اجیرن کریں گے۔ جنسی جرائم میں اضافہ ہوگا۔

یہی سب کچھ اس واقعہ کے بعد ہوا۔ طوائفوں کی بڑی تعداد بازار سے نکل کر شہر کے دیگر محلوں اور بستیوں میں آباد ہو گئی، بعض ڈیرے دارنیاں دوسرے شہروں کو کوچ کر گئیں اور وہ کہ جن کے تعلقات اعلیٰ افسروں، وڈیروں، سیاستدانوں اوباش سرمایہ داروں، سفیروں، ارکان اسمبلیوں، وزیروں اور بیوروکریٹس سے تھے انہوں نے ملنے والی آشیرباد کے بعد بازار چھوڑنے سے انکار کر دیا ان میں سے بیشتر خاندان وہ تھے کہ رقص اور گیت کا پیشہ صدیوں سے جن کی میراث رہا ہے۔ یہ وہی طوائفیں ہیں جن کی بچیاں اب یا تو سرمایہ داروں کی رکھیل ہیں یا سال میں کئی مرتبہ خلیجی ممالک کے دوروں پر جا کر درہم و دینار کی شکل میں دولت سمیٹ کر لاتی ہیں۔ ثقافتی پروگرام کی آڑ میں ملکی غیرت کا جنازہ نکالنے کا یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے۔ کچھ ایسے گھرانے بھی یہاں موجود ہیں جہاں علاقے کی پولیس کی سرپرستی اور اسے ملنے والے معقول معاوضے کے عوض لڑکیاں روزانہ شب بسری کے لیے جاتی ہیں۔ ان میں سے کچھ ورائیٹی پروگراموں، ڈراموں اور فنکشنوں میں بھی حصہ لیتی ہیں جس سے ان کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

بہر حال 36 برس سے اس بازار کے کوٹھے ویران اور رونقیں پامال ہیں۔ اب مدت سے یہاں کی شامیں دھواں دھواں ہیں۔ اب نہ یہاں ڈھولک کی تھاپ سنائی دیتی ہے نہ گھنگروں کی جھنکار نہ ہارمونیم کے سُر کانوں میں شہد گھولتے ہیں نہ ہلکورے لیتے بدن کی بے حجابیاں من میں ہلچل مچاتی ہیں اب اس بازار پر کسی آفت زدہ شہر کی اجڑ جانے والی بستی کا گمان ہوتا ہے۔ وہ طوائفیں جو ناچ گا کر اپنے اور خاندان کی کفالت کرتی تھیں اور وہ سازندے کہ جن کے پیٹ کا رزق طوائف کے پاؤں میں بجتے گھنگروؤں سے وابستہ تھا ان کے گھروں میں جب بھوک

اگنے لگی اور افلاس کا جہنم شروع ہوا تب انہوں نے پیٹ کے جہنم کو کیسے سرد کیا اس بات سے بازار حسن میں رقص پر بندش کے بعد یہاں کے وہ گھرانے جو شرفاؤں کی بستیوں میں جا کر آباد ہوئے انہوں نے وہاں کیا گل کھلائے اور کس طرح در پردہ کوٹھے اور کوٹھی کے فرق کو ختم کیا کس طرح حیا اور دلکشی کے نیلام کو نئے سرے سے پلاننگ کے ساتھ شروع کیا۔ اور اپنے کاروبار کو وسعت دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تحقیق کے مطابق آج حیدرآباد شہر میں جسم فروشی کے (6ہزار) سے زائد مراکز ہیں۔ ان مراکز سے پھیلنے والی گندگی کینسر کی صورت پورے سماج کی رگوں میں اتر چکی ہے۔ ان کی روک تھام نہ تو قانون سے ہو رہی ہے اور نہ ہی کسی اور طریقے سے انکا تدارک کیا جا رہا ہے۔ جس کی بنا پر اخلاقی و معاشرتی قدروں کو تہہ و بالا کرنے والے دھندے میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک اندازے کیمطابق مذکورہ مراکز پر کم از کم 10 سے 12 ہزار لڑکیاں جسم فروشی کے کاروبار سے منسلک ہیں، ثناخوان مشرق کے تقدیس کی نیلامی کے ان ٹھکانوں پر پولیس اور انتظامی اہلکاروں کی سرپرستی میں کھلے بندوں یہ مکروہ کاروبار عرصہ دراز سے بلا روک ٹوک جاری وساری ہے۔ حاصل کی گئی معلومات کے مطابق اس قافلے میں اب ایسے سفید پوش اور شریف النسل گھرانوں کی لڑکیاں بھی شامل ہو چکی ہیں جو قبل ازیں ہولناک مہنگائی اور بے روزگاری کے عذابوں کو سہتے ہوئے کسی طور زندہ تھے جو بھوک کے ہاتھوں سسکتے ہوئے مجبور ہو کر خودسوزی کو ترجیح دینے کی باتیں کرتے تھے۔ ایسے گھرانوں کو زندہ رہنے اور زندگی کو انجوائے کرنے کی ترغیب، طوائفوں کے خاندانوں کی ان تربیت یافتہ لڑکیوں نے دی ہے جو 36 برس سے شہر کے گلی کوچوں میں شرافت کے صدرنگ نقاب چہروں پر سجائے رہائش پذیر ہیں۔ رہی سہی کسر، مجبوری، محرومی، بناوٹ، تصنع، فیشن، حرص اور بھارتی چینلز سے نشر ہونے والے ڈراموں کی بیباکیوں نے پوری کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ برسوں پہلے بازار حسن ہی وہ واحد جگہ تھی جہاں مجرے کرنے والیوں کے علاوہ جسم فروخت کرنے والیاں بھی کثیر تعداد میں موجود تھیں، ایک جانب کوٹھوں سے

گھنگروؤں کی جھنکاروں کے ساتھ بدن کی اداؤں کے لشکارے دکھائی دیتے تو دوسری جانب یہاں کی نیم تاریک اور غلاظت زدہ گلیوں کے مکانوں کی سیڑھیوں پر بناؤ سنگار کر کے نوخیز بیسوائیں کھلے لفظوں کے ساتھ دعوت نظارہ دیتی تھیں۔ ملکی قوانین کو اسلامی روح کے مطابق ڈھالنے ملک میں اسلامی نظام نافذ کرنے اور شریعت کی بالادستی کا شور مچانے والے حکمرانوں کے دور میں بھی جب یہاں مجرے بند تھے تب جسم فروشی کا کاروبار زوروں پر تھا۔ اس کاروبار سے وابستگی اختیار کرنے والی لڑکیوں میں بڑی تعداد ان کی تھی جنہیں ملک کے مختلف علاقوں سے خرید کر لایا جاتا تھا۔ ایسی لڑکیوں میں بنگلہ دیشی لڑکیوں کی تعداد نمایاں ہوتی تھی۔ ان لڑکیوں کو عموماً بازار کی گھاگ اور زمانہ ساز طوائفیں خریدنے کے بعد اپنے شوہر بھائی یا کسی رشتہ دار سے نکاح کرواتی تھیں بعد میں انہیں گناہوں کی دلدل میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ ان خریدار طوائفوں نے چونکہ عمر کا بڑا حصہ بازار میں گزارا تھا اس ناطے ان کے تعلقات پولیس افسروں اور دیگر اہلکاروں سے گہرے ہوتے تھے۔ اس لیے دھندے کا آغاز کرنے والی نئی لڑکی کی مالکن جہاں انٹری فیس کے نام پر متعلقہ تھانے کو بھاری رقم دیتی۔ وہاں نئی لڑکی متعلقہ پولیس افسروں کو کئی راتوں کے لیے بطور نذرانہ بھی دی جاتی تھی بعد میں ان گلیوں سے گزرنے والوں کو اپنے سراپے کی قیمت منہ سے بتانے والی ان لڑکیوں کی زخمی روحیں زبان حال سے پکار پکار کر کہتی تھیں کہ انسانی حقوق کے بحالی کے دعویدار کہاں ہیں؟ حقوق نسواں کی علمبردار تنظیمیں کہاں ہیں؟ ایسی ہی کچلی ہوئی کچھ روحوں کی پکار اپنے وقت کے ایک ایماندار اور باضمیر ایس ایس پی عبدالمجید دستی کے کانوں سے ٹکرائی تب انہوں نے یک بیک جنبش قلم بازار حسن سے غلاظت کا خاتمہ کرتے ہوئے جسم فروشی پر مکمل پابندی عائد کر دی مگر ہوا کیا؟

پہلی مرتبہ 1974ء کے بعد ناچ گانے سے تعلق رکھنے والی طوائفیں شریفوں کے محلوں میں آ کر آباد ہوئیں اور دوسری مرتبہ 1985ء کے بعد جسم فروش طوائفوں نے بڑے دھڑلے سے متوسط طبقے کی آبادیوں میں گھر بنانے اور بسانے شروع کر دیئے، یوں گندگی ایک جگہ سے

نکل کر شہر بھر میں پھیل گئی۔ سروے رپورٹ کے مطابق شہر کی وسیع اور قدرے نئی آبادی نورانی بستی سے لے کر دریا پار قائم ہونے والی گنجان آبادی تک اس کی جڑیں تیزی سے پھیل گئی ہیں۔ نتیجے میں اس کی زد میں آنے والی سینکڑوں شریف لڑکیاں مسلسل بربادی اور رسوائی کی گہری کھائی میں گر رہی ہیں اور انہیں سنبھالنے والا سماج خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہا ہے۔

ہو یہ رہا ہے کہ کہیں یہ کاروبار ایک کمرے میں چل رہا ہے اور کہیں کئی کنال پر پھیلا ہوا بنگلہ اس کام کے لیے مختص ہے۔ ان لڑکیوں میں جوان اور خوبصورت لڑکیوں کا ایک گروہ وہ ہے جو دن کے وقت سرکاری دفاتر میں بھیک مانگتا ہے۔ اس کے دوران حسب منشا گاہک پھنسانے کا کام بھی ہوتا رہتا ہے۔ وقت اور معاوضے طے ہونے کے بعد یہ طے شدہ مقام پر پہنچ جاتی ہیں۔ یہ لڑکیاں تین اور چار کی ٹولیوں میں سول کورٹ، سیشن کورٹ، ریونیو کے دفاتر اور شہباز بلڈنگ کے مختلف دفتروں اور اس کے قرب و جوار میں آپ کو گھومتی پھرتی نظر آئیں گی۔ کال گرلز کی دوسری قسم وہ ہے جو صبح 10 اور 11 بجے کے درمیان گھروں سے نکلتی ہے اور شام 5 بجے تک گھروں کو واپس چلی جاتی ہے۔ یہ اپنے معاملات دن بھر میں بھگتا لیتی ہیں۔ گھر اور خاندان والوں کے نزدیک یہ کسی دفتر یا ادارے میں ملازمت کرتی ہیں۔ شام چار بجے کے بعد ان کے موبائل آپ کو آف ملیں گے۔ یہ اپنے پیشے کے اصولوں پر کاربند رہتی ہیں۔ بڑی سے بڑی رقم کا لالچ بھی انہیں رات گھر سے باہر گزارنے پر مجبور نہیں کر سکتا، ایسی لڑکیاں عموماً گاڑی کھاتہ اور حیدر چوک کے ریستورانوں، ضلع کونسل کے نزدیک قائم ہوٹلوں، لطیف آباد کے بعض کیفوں، آٹو بھان روڈ کے فاسٹ فوڈ سینٹروں اور آئسکریم کارنروں پر بیٹھ کر اپنے موبائل پر آنے والی کالوں کا انتظار کرتی ہیں۔ سول کوٹ کے عقب میں ٹریژی آفس سے کنٹونمنٹ کی طرف جانے والی سڑک عموماً سنسان رہتی ہے۔ بیشتر پیشہ ور لڑکیاں اپنے گاہکوں کو اسی سڑک کا پتہ دیتی ہیں یہ برقعہ پہن کر رکشہ میں سوار آتی ہیں اور پہلے سے طے شدہ پوائنٹ پر کار یا موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اپنے گاہک کے ساتھ چل دیتی ہیں۔ یہاں سے بکنگ پر جانے والی اکثر

لڑکیاں اس بازار کی ہوتی ہیں۔ لڑکیوں کی ایک قسم وہ ہے جو لبرٹی مارکیٹ، ایل ایم سی کے قریب، سینٹرل جیل کے نزدیک اسٹاپ پر، فقیر کے پڑ کے بازار میں، کسٹمر سینٹر پر، زنانہ ہسپتال کے قریب اور نیا پل کے پاس آپ کو منڈلاتی یا انتظار کی کیفیت میں کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ مخصوص اشاروں کے ذریعے گاہک کو اپنی جانب راغب کرتی ہیں۔ انہیں پہچاننے اور ان کے اشاروں کو سمجھنے والے پہلی نظر میں ہی انہیں جان جاتے ہیں، دھندا کرنے والیوں کی ایک قسم وہ ہے جو شہر کے پوش علاقوں میں مہنگے داموں مکان کرائے پر لے کر رہتی ہیں یہ لڑکیاں عموماً اسٹیج ڈراموں اور دیگر ثقافتی پروگراموں میں فعال رول ادا کر کے اپنے اوپر اداکارہ ہونے کا لیبل لگاتی ہیں جس سے ان کی ڈیمانڈ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ڈرامے کی فیلڈ میں بعض سرپرست انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں ان کے فوٹو سیشن کرائے جاتے ہیں ان کی سالگراؤں کی تقریبات دھوم دھام سے منائی جاتی ہیں۔ ان تقریبات کی خبریں اور تصویریں اخبارات میں چھپتی ہیں تو انہیں منہ مانگے داموں اپنے آپ کو کیش کرانے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ لڑکیاں عام طور پر سرمائے کے لحاظ سے بھاری بھرکم شخصیت کو پھانسنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ ایک طے شدہ معاوضے کے تحت مہینوں اس شخصیت سے نتھی رہتی ہیں۔ اس دوران اپنے دیگر عاشقوں سے بھی مسکراہٹوں اور اداؤں کے دام وصول کرتی رہتی ہیں۔

سروے کے دوران ملنے والی ایک کال گرل سے جب اس کا نام پوچھا گیا تو اس نے ہنستے ہوئے اپنا نام شمع بتایا پھر کہنے لگی نام سے کیا فرق پڑتا ہے ہمارے نام تو صبح دوپہر شام بدلتے رہتے ہیں کبھی بشریٰ، کبھی نرگس، کبھی صائمہ، کبھی نازیہ تو کبھی کچھ اور۔۔۔ نام اتنی تیزی سے بدلتے ہیں کہ اب اپنا اصلی نام ہمارے دھیان میں ہی نہیں رہتا۔ شمع جب نئی نئی اس طرف آئی تھی اکیلی گھوم پھر کر دھندہ کرتی تھی اب چونکہ وہ پختہ کار اور جاندیدہ عورت بن گئی ہے۔ تو اس کا اپنا گروہ ہے جس میں پانچ سے دس لڑکیاں شامل ہیں۔ اس سوال پر کہ آپ یہاں تک کیسے پہنچیں۔۔۔؟ اس نے بتایا جب میں چھوٹی تھی میرے باپ کا انتقال ہو گیا تھا، ماں نے جلد

ہی دوسری شادی کرلی، دوسرا باپ ہر چند کہ ایک معزز پیشے سے تعلق رکھتا تھا مگر نیت کا خراب تھا جب میں سیانی ہوئی تو وہ پیر دبانے کے بہانے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیتا تھا اس دوران وہ میری ماں کو نیند کی گولیاں دے دیتا تھا اور مجھے بے آبرو کرتا تھا یہ سلسلہ مہینوں چلتا رہا، کراچی میں مقیم میرے بھائی کو باپ کی حرکتوں کا پتہ چلا تو اس نے میرے اور باپ کے خلاف تھانے میں رپورٹ کرا دی۔ پولیس نے مجھے اور میرے باپ کو گرفتار کرلیا۔ میرا باپ جیل چلا گیا۔ پولیس نے کسی طرح مجھے چھوڑ دیا تاہم اپنے باپ کو جیل سے چھڑانے کے لیے مجھے گھر سے باہر آنا پڑا کیونکہ باپ کے جیل جانے کی ذمہ دار میری ماں مجھے سمجھتی تھی پھر جن لوگوں نے باپ کو جیل سے نکلوانے میں میری مدد کی انہیں اپنے احسان کا صلہ چاہیے تھا اس طرح ان احسانوں کا بدلہ چکاتے چکاتے میں بہت دور نکل گئی پھر ماں اور باپ دونوں کو پیسے کی لت پڑ گئی وہ روز مجھے یہ کہہ کر گھر سے نکال دیتے تھے کہ انہیں پیسے چاہیں اور حقیقتاً پیسے کی ضرورت بھی تھی جب میں نے بھائی کے خلاف بیان دیا تو وہ ناراض ہو کر کراچی چلا گیا ادھر جیل سے آنے کے بعد باپ کی وہی عیاشیاں تھیں۔ اب وہ دن بھر گھر میں پڑا رہتا تھا اور مجھ سے چھوٹے بہن بھائیوں کی حسرتیں اور بھوک دیکھی نہیں جاتی تھی۔

فوزیہ کا تعلق شہر کے ایک گنجان آباد علاقے سے ہے، 18، 20 سال کی فوزیہ قدرے خوبصورت اور بڑی بڑی آنکھوں والی ایک غیر پڑھی لکھی مگر ہشیار لڑکی ہے۔ اس سوال پر کہ آپ یہاں تک کیسے پہنچیں؟ اس نے بتایا کہ میں نے اپنی خالہ کے یہاں پرورش پائی ہے مجھے نہیں معلوم میرے ماں باپ کون ہیں۔ خالہ کا کہنا ہے کہ وہ ٹرین کے ایک حادثے میں مر چکے ہیں۔ ان کے ساتھ میرے دو بھائی بھی تھے۔ میں سات سال کی تھی جب خالہ کے گھر آئی یہاں بچپن سے جوانی تک مجھے جھڑکیاں اور گالیاں سننے کو ملتی رہیں۔ میں اس ماحول سے بہت تنگ تھی پڑوس میں رہنے والے ایک لڑکے عمر نے مجھ سے دوستی گانٹھ لی میں اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئی ایک دن موقع پا کر اس نے اپنا کھیلا کھیلا۔ میری آنکھ کھلی جب یہ خطا گناہ بن کر

میرے اندر پرورش پانے لگی۔ خالہ نے کسی طرح پیسے خرچ کرکے میری جان چھڑائی مگر اب وہ میری اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے لگی۔ پہلے تو وہ اپنے جاننے اور ملنے والوں سے میرا سودا کرواتی رہی بعد میں یہ ہوا کہ مجھے روزانہ گھر سے یہ کہہ کر نکال دیتی کہ شام کو آؤ تو پیسے لے کر آنا بس پھر کیا تھا سلسلہ چل پڑا اور اب تک جاری ہے۔

گورے چٹے رنگ اور بھرے بدن والی ایک کال گرل سے جب نام پوچھا گیا تو اس نے فرضی نام نائیلہ بتایا تاہم ہمارے اس سوال پر کہ آپ یہاں تک کیسے پہنچیں؟ اس کا کہنا تھا کہ میری ماں محکمہ پولیس میں کام کرتی تھی اس ناطے وہ اکثر گھر سے باہر رہتی باپ سے اس کا ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا ایک دن تنگ آ کر باپ ماں کو طلاق دے کر چلا گیا بعد میں اس نے اپنے ایک آشنا پولیس والے سے شادی کرلی۔ چار بہن بھائی ہم پہلے تھے یہاں بھی ماں ہر سال بچے پیدا کرتی رہی۔ نتیجے میں بہن بھائیوں کی تعداد بڑھتی گئی میں گھر میں سب سے بڑی تھی ماں نے نوکری چھوڑ دی اور باپ بھی ہڈ حرام ہو گیا۔ پھر ایک دن وہ ہمیں چھوڑ کر اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے گھر چلا گیا۔ غربت پریشانی اور فاقوں سے تنگ آ کر میری ایک بہن گھر سے بھاگ گئی میں نے شرافت کی زندگی گزارنے کی بہت کوشش کی، بہت مزاحمت کی مگر میری ماں نے مجھے دھندے پر لگا دیا یوں اب میرے تمام بہن بھائی اور ماں میری کمائی پر پل رہے ہیں۔

کرن کے گھر والے بازار حسن میں رہائش رکھتے ہیں وہیں سے فون پر سودے بازی ہوتی ہے، پہلے کرن اپنی مامی کو ساتھ لے کر نکلتی تھی مگر اب تنہا نکلتی ہے اس کا کہنا ہے کہ جوانی کی دہلیز عبور کرتے ہی ان کے گھر والوں نے اس کا سودا کر دیا تھا۔ اس کی نتھ اترائی کی رسم شہر کے ایک صنعت کار نے ادا کی تھی بعد میں وہ باقاعدہ دھندہ کرنے لگی۔ کرن کا کہنا ہے کہ اس نے کئی بار اس مکروہ دھندے سے نجات کی کوشش کی مگر ہمیشہ ناکام رہی اس لیے کہ یہاں سب غرض کے غلام ہیں، گھر والوں کو اس نے منع کیا تو اس پر تشدد کیا گیا مجبور ہو کر اس نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا ہے اب وہ تقریباً ہر رات گھر سے باہر شمع محفل بن کر قطرہ قطرہ پگھل رہی ہے اور

زندہ ہے۔

آپ یہاں تک کیسے پہنچیں؟ جواب میں چھریرے بدن، کتابی چہرے اور غزالی انکھوں والی طاہرہ کا کہنا تھا کہ ہم کندھ کوٹ میں رہتے تھے۔ مجھے ڈھنگ سے یاد نہیں کہ میرے گھر میں کون کون تھا۔ بہر حال باپ کی شفقت اور محبت سے میں بچپن سے محروم تھی۔ اچھی طرح یاد ہے کہ ماں صبح سویرے اٹھا دیتی تھیں پھر مجھے بہت سارے کام کرنا پڑتے تھے چھوٹی تھی جب ہی ماں نے نکاح کر دیا تھا شوہر بڑی عمر کا تھا وہ مجھے بلاوجہ ہی مارتا تھا پھر وہ کام دھندے کی تلاش میں مجھے لے کر یہاں آ گیا اسے تو کام ملا نہیں البتہ مجھے کام سے لگا دیا اس کا واسطہ کچھ ایسے لوگوں سے پڑ گیا جو یہ غلیظ دھندہ کرتے تھے آج کل شوہر بیمار ہے میں اس کا علاج کرا رہی ہوں، تین بچے ہیں جن کی دیکھ بھال شوہر کرتا ہے۔

عذرا غیر مسلم ہے دیکھنے میں دھان پان سی اور کمسن سی ہے مگر جب باتیں کرنے پر آئے تو بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ پہلے اس نے خاصی عامیانہ اور بے سروپا باتیں کیں مگر فوراً ہی نیاز مندی عود کر آئی اور معذرت کرنے لگی اس سوال پر کہ آپ یہاں تک کیسے پہنچیں۔۔۔؟ عذرا نے بتایا میرے بابا ٹرک ڈرائیور تھے ماں سارا دن گھر میں اکیلی ہوتی تھی میرے رشتے کا ایک چچا گھر میں آتا تھا ماں نے اس سے یارانہ گانٹھ رکھا تھا ایک دن باپ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا راستے کا کانٹا ہٹ گیا اب ماں آزاد تھی وہ کھلے بندوں اپنے دیور یعنی چچا کے ساتھ رہنے لگی پھر وہ اپنے دوستوں کو بھی لے کر آنے لگا محلوں والوں کے کہنے سننے پر ماں نے گھر بدل دیا۔ دوسرے محلوں کا ماحول بھی خراب تھا مگر ماں کے مزاج کے مطابق تھا۔ چچا اور ماں میرے سامنے ہی غلط حرکتیں کرتے تھے۔ ایک دن چچا کے ایک دوست سے ڈھیر سارے پیسے لے کر ماں اور چچا نے مجھے اس کے حوالے کر دیا بس وہی میری بربادی کا دن تھا میں تنگ آ کر اپنی خالہ کے گھر سکھر چلی گئی مگر وہ تو ماں سے بھی بڑھ کر تھی۔ اس نے اپنی لڑکیوں کی دکان کھول رکھی تھی۔ ماں مجھے واپس لے آئی اور میری تربیت کرنا شروع کر دی مجھے کس طرح کے

کپڑے پہننے ہیں شام کو کس طرح کی خوشبو لگانی ہے کس طرح اجنبی کو اسیر کرنا ہے کس طرح اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ آنے والے کی جیب میں کتنی رقم ہے آپ یقین جانیں میں دو باتیں کرنے کے بعد ہی پہچان لیتی ہوں کہ سامنے والا کس قماش کا ہے اور کتنے پانی میں ہے۔ (قہقہہ)

سوال یہ ہے کہ جسم فروش اتنی ارزاں کیوں ہے؟

اس کا ایک سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ جہاں اور جس سماج میں ضمیر فروشی ہوگی وہاں جسم فروشی بھی ہوگی۔ سیاسی بہروپیوں، فتویٰ فروشوں۔ محنت کا استحصال کرنے والوں اور حاکم لٹیروں کی حیثیت بھی تو ہمارے یہاں طوائفوں جیسی ہی ہے بس بکنے کے اپنے اپنے طریقے ہیں۔ پھر یہ کہ جہاں پورا معاشرہ رشوت اور سفارش کی اینٹوں پر کھڑا ہو جہاں سچائی کے سامنے پیسے اور بناوٹ کی دیواریں کھڑی ہوں جہاں سعی پیہم کو ناکام بنا کر اذہان کو بانجھ کیا جاتا ہو جہاں طبقاتی تقسیم کی جڑیں گہری ہو چکی ہوں جہاں دوہرا معیار زندگی کامیابی کی ضمانت ہو، جہاں فکری ارتقا مفلوج ہو وہاں جسموں اور ضمیروں کی منڈیاں یونہی سجی رہتی ہیں۔

جی ہاں آج کا معاشرہ ایسی عورتوں سے بھرا پڑا ہے جو بدن کے تیشے سے زندگی کی نہر کھود رہی ہیں۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے۔۔۔ محروم لوگوں کے پاس اپنے ہی بدنوں میں کود کر خودکشی کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا اور پھر یہ کہ جن معاشروں میں انسانوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی وہاں ’’جسم‘‘ بہت قیمتی ہوتے ہیں۔

(بشکریہ: سید سرور ندیم)

✿

کراچی نیپئر روڈ: کوٹھے سے کوٹھی تک

نیپئر روڈ کسی زمانے میں طوائفوں کا گڑھ ہوتا تھا۔ اس سڑک کا نام سندھ کے پہلے گورنر سر چارلس نیپئر کے نام پر رکھا گیا تھا۔ جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں جب یہ بازار اُجڑ گیا اور طوائفوں نے تھیٹروں اور پوش علاقوں میں ڈیرے جمائے تو اس سڑک کا نام متحدہ قومی موومنٹ کے سربراہ الطاف حسین سے موسوم کر دیا گیا۔

طوائفیں اب زیادہ تر کام اپنے دلالوں کے ذریعے کرتی ہیں جبکہ ایک ہزار سے لے کر 20 ہزار تک سیکس ورکرز اس علاقہ میں ہی اپنے دھندے کو ترجیح دیتی ہیں۔ چکلوں پر پابندی کے بعد کراچی میں سیکس ورکرز کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اکثر دوسرے اضلاع سے لڑکیاں کراچی کے مختلف اڈوں پر آ کر کام کرتی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اقتصادی بدحالی دور کرنے کا یہ آسان نسخہ ہے۔

کراچی کی میڈم رابعہ کلی سے پھول بننے والی دوشیزہ کے لیے 20 ہزار روپے تک طلب کرتی ہے تمام اس کے جاننے والے اس کو بھابی کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ اس بات کی گارنٹی بھی دیتی ہے کہ پیش کی جانے والی لڑکی کنواری ہے۔ وہ نوعمر لڑکی کو تتلی کے نام سے پکارتی ہے اس کا کہنا ہے کہ اب بازار اس قدر مندے کا شکار ہے کہ بیس ہزار سے زائد کوئی نہیں دیتا ورنہ کبھی کنواری لڑکی کے پچاس ہزار تک بھی مل جاتے تھے پھر نتھ اترائی کی مٹھائی کے پیسے الگ سے ملتے تھے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کراچی میں ''کال گرلز'' کی بھرمار ہے اور اس کاروبار

میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑکیاں پاکستان کے مختلف علاقوں سے آتی ہیں۔ اس کے علاوہ بنگلہ دیش، وسطی ریاستوں، افغانستان وغیرہ سے بھی یہاں لڑکیاں آ کر دھندہ کرتی ہیں۔ گذشتہ دس سال کے دوران دو لاکھ کے قریب لڑکیاں اس شہر میں دوسرے ملکوں سے آئی ہیں۔

پاکستان میں یوں تو سیکس ورکرز پر پابندی ہے لیکن کسی نہ کسی آڑ اور کسی نہ کسی شخصیت کی بنا پر یہ لڑکیاں اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہوتی ہیں اور قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی ان کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کی طرف سے اسلام نافذ کرنے کے جھوٹ کے ساتھ ساتھ چکلے تو بند ہوئے لیکن یہ ایک قسم کے اداروں کی پشت حاصل کر گئے اور شہروں کے پوش علاقوں میں انہوں نے ڈیرے ڈیرے جما لیے جہاں طوائفوں کے علاوہ عام لڑکیاں بھی اس دھندے کی طرف راغب ہو گئیں۔ غربت، فاقہ کشی اور گھریلو حالات نے ان لڑکیوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنا جسم بیچ کر گھر کے اخراجات پورے کریں۔ ایک کال گرل کا کہنا ہے کہ میری ساری فیملی میری آمدنی سے گزر بسر کرتی ہے کیونکہ میرا باپ فوت ہو چکا ہے۔ میری ماں ہے چھوٹے بہن بھائی ہیں اور مجھے دس ہزار روپے ماہانہ کما کر ان کو دینا پڑتے ہیں۔ مجھے طلاق بھی ہو چکی ہے میں اتنا پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں لہٰذا میں آنٹی شمیم کے ذریعے اپنا کام کرتی ہوں جو مجھے چالیس فیصد تک رقم دیتی ہے باقی خود رکھ لیتی ہے کیونکہ وہ مجھے تحفظ فراہم کرتی ہے اگر کبھی چھاپہ پڑ جائے تو ضمانت وغیرہ بھی کراتی اور وکیل بھی کرتی ہے۔ بعض لڑکیاں ماہانہ تنخواہ پر بھی یہ دھندہ کرتی ہیں۔ ساہیوال سے آنے والی ایک لڑکی کا کہنا ہے کہ میرے والدین نے میرا ایک لاکھ روپیہ وصول کر لیا ہے جس کے بدلے میں مجھے تین ماہ تک گوگا بھائی کے ساتھ رہنا پڑا وہ میرا سودا کر کے کتنے گاہکوں سے کتنے پیسے کماتا ہے اس سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔ اس کا رویہ میرے ساتھ بہت بہتر ہے بالکل بھائیوں کی طرح۔ مجرا کے وقت طے شدہ رقم دلال لیتا ہے

بقایا انعامات وغیرہ اور ٹپیں لڑکی کی ہوتی ہے۔ زیادہ پیسہ کمانے کے لیے اکثر لڑکیاں رقص ضرور سیکھتی ہیں۔ رقص کے دوران اکثر تماش بین شراب کے نشے میں دھت ہو کر لڑکیوں پر نوٹوں کی بارش بھی کر دیتے ہیں۔ زیادہ تر نوعمر لڑکیاں ہی کمائی کرتی ہیں جوں ہی ٹین ایج سے اوپر ہوتی ہیں ان کی آمدنی محدود ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ جب تک لڑکی نوعمر ہوتی ہے وہ ایک چیک کی طرح ہوتی ہے جو کسی وقت بھی بلکہ ہر اتوار کو کیش کرایا جا سکتا ہے لیکن عمر زیادہ ہو تو وہ باسی مچھلی کی طرح ہو جاتی ہے۔ اکثر لڑکیاں اپنے دلال کے ساتھ آٹھ دس ماہ ہی کام کرتی ہیں اس کے بعد وہ خود کفیل ہو جاتی ہیں یا پھر خود لڑکیاں سپلائی کرنے لگتی ہیں۔ آنٹی شمیم کسی زمانے میں ''کال گرل'' تھی پھر وہ دلالہ بن گئی۔ اب اس کے پاس دس لڑکیاں ہیں۔ وہ اب موبائل فون کے ذریعے کام چلاتی ہے۔ اسے مختلف گاہکوں کے فون آ جاتے ہیں اور وہ لڑکیوں کو کار کے ذریعے مختلف مقامات پر ڈراپ کرا آتی ہے۔ ایک دلال کا کہنا ہے کہ پولیس انہیں بلیک میل کر کے اچھی خاصی رقم کماتی ہے۔ بڑے شہروں میں اب دلالوں کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ موبائل فون کے ذریعے گاہک براہ راست لڑکی سے رابطہ کر لیتا ہے اور لڑکی مقررہ جگہ پر خود پہنچ جاتی ہے۔ پولیس والے بعض اوقات بھتہ کے ساتھ لڑکیوں کی بھی ڈیمانڈ کرتے ہیں۔ اکثر سیکس ورکرز لڑکیاں کمرشل ایریا میں رہنا پسند کرتی ہیں۔

ایک لڑکی نے بتایا کہ بعض اوقات جب ایک دو آدمی رات کے لیے سودا کرتے ہیں تو نشے میں دھت چھ چھ آدمیوں سے بھی واسطہ پڑ جاتا ہے۔ میں نے تیسرے کے بعد جب انکار کیا تو نہ صرف مجھے پیٹا گیا گالیاں دی گئی بلکہ میرے ساتھ زبردستی بھی کی گئی اور اس کے بعد میں ایک ہفتہ تک بیڈ سے اٹھنے کے قابل نہیں رہی۔ لڑکیوں کو مختلف عمروں کے مردوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے لیکن یہ سب قبول کرنا پڑتا ہے پیسہ کمانے کی خاطر۔

بعض لڑکیاں بوڑھے بیوروکریٹس کو بلیک میل بھی کرتی ہیں جو کہ صرف ان سے دوستی کی

توقع رکھتے ہیں ان پر خوب خرچ بھی کرتے ہیں۔ لڑکیاں انہیں یوں ہی امید سے ہونے کا کہہ کر پیسہ بٹورتی رہتی ہیں جبکہ عملی طور پر ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

کراچی کے بعض بیوٹی پارلر اور ہوٹل بھی کال گرلز کو رستہ دکھاتے ہیں ایک لڑکی کا کہنا ہے کہ پہلی بار میں ایک دوست کے ساتھ بیوٹی پارلر گئی پھر میری جھجک کھل گئی اور میں براہ راست ان کے ذریعے دھندے کرنے لگی اس طرح بعض ہوٹلوں سے بھی میرا رابطہ ہوا اور میں ان کے فون کا انتظار کرنے لگی۔

✿

سیکس ورکرز کے لیے کراچی میں ورکشاپ

ایڈز کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے خواتین سیکس ورکرز میں محفوظ جنسی طریقے اپنانے کے لیے اقوام متحدہ کے ادارے یو این ایف پی اے کے تعاون سے کراچی میں اپنی نوعیت کے پہلے تین روزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا جو سنیچر کو اپنے اختتام کو پہنچی اور اس میں ایک سو سے زیادہ خواتین سیکس ورکرز نے شرکت کی۔

پاکستان میں جسم فروشی پر پابندی ہے تاہم یہ کاروبار غیر قانونی طور پر جاری ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے یو این ایف پی اے اور مقامی غیر سرکاری تنظیموں کی جانب سے منعقد کردہ اس ورکشاپ میں خواتین سیکس ورکرز کو محفوظ جنسی طریقوں سے آگاہی دی گئی۔ ورکشاپ میں شرکت کرنے والی خواتین کا کہنا ہے کہ انہیں اس ورکشاپ میں شرکت کرنے سے پہلے ان طریقوں سے اتنی زیادہ آگاہی نہیں تھی اور یہ ورکشاپ ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔

یونائیٹڈ نیشنز پاپولیشن فنڈ یعنی یو این ایف پی اے کے پراجیکٹ افسر ڈاکٹر صفدر کمال پاشا کا کہنا ہے کہ ان کے پاس پورے پاکستان کے اعداد و شمار تو نہیں ہیں لیکن اس وقت ایک سروے کے مطابق کراچی میں ایک لاکھ سے زیادہ اور لاہور میں پچھتر ہزار خواتین سیکس ورکرز کام کر رہی ہیں اور ان میں محفوظ جنسی طریقوں کے بارے میں آگاہی سے ایڈز کے پھیلاؤ میں بڑی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ ایک مسلم ملک یعنی بنگلہ دیش میں اس کاروبار کو قانونی تحفظ حاصل ہے لیکن پاکستان میں اسے قانونی تحفظ حاصل نہیں ہے اور یہ ہی وجہ ہے کہ اس ورکشاپ کو منعقد کرنے سے پہلے یہ خدشات تھے کہ یہاں قانون نافذ کرنے والے اداروں کے خوف سے سیکس ورکرز اپنے آپ کو ظاہر نہ کرنے کی وجہ سے شرکت نہیں کریں گی۔

ان کے بقول اس ورکشاپ کے اختتام پر ایک سو سے زیادہ تعداد میں سیکس ورکرز کی شرکت سے ہماری امیدوں سے بڑھ کر حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جن خواتین سیکس ورکرز نے یہاں محفوظ جنسی طریقوں کے بارے میں آگاہی حاصل کی ہے امید ہے وہ اپنے ساتھ کام کرنے والیوں کو بھی اس بارے میں آگاہی دیں گی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس ورکشاپ کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے اگلی ورکشاپ لاہور میں منعقد کی جائے گی اور پھر اسی موضوع پر اگلے برس قومی کنونشن بھی منعقد کرنے کا ارادہ ہے جس میں ملک بھر سے سیکس ورکرز کو مدعو کیا جائے گا۔

یو این ایف پی اے نے یہ ورکشاپ کراچی میں مختلف غیر سرکاری تنظیموں کے تعاون سے منعقد کی تھی جس میں سرفہرست جینڈر اینڈ ریپروڈکٹو ہیلتھ فورم یعنی جی آر ایچ ایف ہے، جس کے سربراہ مرزا علیم بیگ کا کہنا ہے کہ ان کی تنظیم سولہ برس سے سیکس ورکرز میں آگاہی اجاگر کرنے کے لیے کام کر رہی ہے۔

ان کے بقول محفوظ جنسی طریقوں میں میل اور فیمیل کنڈوم کے استعمال اور دیگر مختلف مسائل پر نہ صرف آگاہی دی گئی بلکہ سیکس ورکرز ہی میں سے چند کو ٹرینرز کے طور پر تیار کیا گیا ہے جو اپنے ساتھ کام کرنے والیوں کو محفوظ جنسی طریقوں کے بارے میں آگاہی دیں گی تاکہ ایڈز اور دیگر جنسی بیماریوں کے پھیلاؤ کو مسدود کیا جا سکے۔

اس ورکشاپ کے آرگنائزر اور جی آر ایچ ایف کے رکن ڈاکٹر غلام مرتضیٰ نے بتایا کہ تین روزہ اس ورکشاپ میں شرکت کرنے کے لیے خواتین سیکس ورکرز کے لیے ایک ہزار

روپے یومیہ معاوضے کی ترغیب بھی دی گئی تاکہ وہ زیادہ تعداد میں شرکت کریں۔ ان کے بقول ایڈز کا پھیلاؤ کی بڑی وجوہات انتقالِ خون یا پھر جنسی روابط ہیں اور ان کی تنظیم، اقوامِ متحدہ کے ادارے کے تعاون سے جنسی طریقوں کو محفوظ بنانے پر توجہ دے رہی ہے۔

نادیہ پانچ سال سے بطور سیکس ورکر کام کر رہی ہیں اور ان کے بقول اس ورکشاپ میں شرکت کرنے سے انہیں بہت معلومات حاصل ہوئیں ہیں۔ ان کے بقول مجھے پہلی بار پتہ چلا ہے کہ ایسی اشیاء موجود ہیں جو جنسی رابطے کو محفوظ بناتی ہیں جبکہ یہاں ان کا استعمال بھی بتایا گیا ہے۔ میں نے ایڈز کا نام سنا تھا لیکن مجھے یہ نہیں پتہ تھا کہ یہ پھیلتا کس طرح ہے لیکن اس ورکشاپ میں مجھے اس بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں ہیں اور مجھے یہ ورکشاپ بہت اچھی لگی ہے۔

زیبا رمضان نے آنکھ ہی ریڈ لائٹ ایریا میں کھولی۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک منفرد ورکشاپ ہے جس میں پہلی بار ہمیں ایک فورم پر اکٹھا کیا گیا ہے، ایسے ورکشاپ ہر سال ہونے چاہیے، اس ورکشاپ سے پہلے ہم چھپے ہوئے تھے لیکن اب ہم بھی معاشرے کے سامنے آ گئے ہیں اور ہم اپنے بارے میں آواز اٹھانے کے قابل ہو گئے ہیں، اب میں جی آر ایچ ایف تنظیم کی ممبر کی حیثیت سے اعتماد کے ساتھ اپنی اور اپنی برادری کے حقوق کے لیے آواز بلند کر سکتی ہوں۔

(بہ شکریہ بی بی سی اردو سروس)